اصولِ تفسیر اور علومِ قرآن پر ایک نہایت اہم کتاب

تالیف:

شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ

ترجمہ:

پروفیسر مولانا محمدؒ رفیق چودھری

اُصولِ تفسیر اور علوم القرآن پر ایک نہایت اہم کتاب

تالیف

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ترجمہ

پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری

فہرست عنوانات

عرضِ مترجم

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یہ کتاب ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' فارسی زبان میں لکھی گئی۔ بعد میں اس کے عربی اور اُردو ترجمے کیے گئے۔

اس کتاب کا موضوع علوم القرآن ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک قرآن مجید میں کل پانچ بنیادی علوم (علوم پنجگانہ) کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں اُنہوں نے ان پانچوں علوم کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں قرآن فہمی اور تفسیر کے اُصولوں کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

اگرچہ مترجم کو اس کتاب کے چند ایک مقامات مثلاً حروفِ مقطعات کی بحث پر مصنف کی آراء سے اختلاف بھی ہے تاہم ترجمے میں دیانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں صرف شاہ صاحب ہی کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ایک آدھ مقام پر اختلافی نوٹ بھی درج کر دیا ہے۔

اس کتاب کی افادیت مسلّم ہے۔ یہ اپنے موضوع پر مختصر اور جامع کتاب ہے۔ اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر اسے بہت سی جامعات نے داخل نصاب کر رکھا ہے۔

اس کتاب کے اُردو تراجم موجود ہیں مگر افسوس ان میں سے کوئی ایک بھی میرے خیال میں ایسا نہیں جسے عام آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہو کیونکہ وہ مشکل اور ادق اصطلاحی ترجمے ہیں۔ میں نے اسی ضرورت کے پیش نظر اس کتاب کا نہایت آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ قرآنی علوم مترجم کا خاص موضوع بھی ہے اس لیے میں نے یہ ترجمہ ذوق و شوق سے کیا ہے۔

ترجمے کے علاوہ میں نے اس میں مزید یہ کام بھی کیا ہے کہ؛

1۔ کتاب کے شروع میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مختصر حالاتِ زندگی شامل کر دیے ہیں۔

2۔ کتاب کی فصول ختم کر دی ہیں اور اُن کو قارئین کی آسانی کے لیے نئے ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔لیکن اصل کتاب کے مواد کی ترتیب باقی رکھی ہے۔

3۔ کتاب میں مذکور تمام قرآنی آیات، احادیث اور عربی عبارات پر اعراب لگا دیے ہیں۔

4۔ تمام آیات کا اُردو ترجمہ کیا ہے اور ہر آیت کا مکمل حوالہ دے دیا ہے۔جس میں سورت کا نام اور آیت کا نمبر لکھ دیا ہے۔

5۔ عام قارئین کی سہولت کے لیے بہت سے ذیلی عنوانات بھی قائم کر دیے ہیں۔

6۔ بعض مشکل الفاظ کی وضاحت کے لیے اُن کے انگریزی مترادفات (Synonymous) بھی دے دیے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ قرآنیات کے سلسلے کی اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسے طلبہ اور عام قارئین کے لیے مفید اور بابرکت بنائے۔آمین

لاہور

28 اگست 2004ء

مطابق 11 رجب 1425ھ

والسلام

محمد رفیق چودھری

شاہ ولی اللہؒ کے مختصر حالاتِ زندگی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، اصولی، متکلم، مفکر، صوفی اور وقت کے مجدد تھے۔

نام ونسب:

آپ کا اصل نام قطب الدین احمد تھا لیکن آپ شاہ ولی اللہؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ والد کا نام شاہ عبدالرحیم اور دادا کا نام شاہ وجیہ الدین تھا۔ شجرہ نسب 29 پشتوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک جا ملتا ہے۔ والدہ کا نسب حضرت موسیٰ کاظم تک جاتا ہے۔

پیدائش:

آپ 4 شوال 1114ھ، مطابق 10 فروری 1703ء کو ضلع مظفر نگر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔

بچپن اور ابتدائی حالات:

شاہ صاحب ابھی پانچ برس کے تھے کہ اُن کو مدرسے میں بٹھا دیا گیا۔ ساتویں سال نماز، روزہ شروع کرا دیا گیا۔ اور اسی سال آپؒ نے قرآن کا حفظ مکمل کر لیا۔

اس کے بعد مروجہ اسلامی علوم حاصل کیے۔ ان کی باقاعدہ سند لی اور تدریس کی اجازت مل گئی۔

چودہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت

کی اور سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک ہوئے۔ سترہ برس کے تھے کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد قریباً بارہ برس تک دہلی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

1730ء (1143ھ) میں حج کے سفر پر روانہ ہوئے۔ حجاز میں حج کے علاوہ 14 مہینے قیام کیا۔ اس دوران میں حرمین کے علماء بالخصوص شیخ ابو طاہر مدنی سے احادیث کی کتابیں پڑھیں۔ اُن سے سند اور اجازت لی۔ شیخ ابو طاہر نے آپ کو جو سند دی اس میں یہ بھی لکھا کہ:

''شاہ ولی اللہ مجھ سے حدیث کے الفاظ کی سند لیتے تھے اور میں اُن سے حدیث کے معانی کی اصلاح لیتا تھا۔''

اگلے سال 1144ء میں آپ نے دوبارہ حج کیا۔ اور اُس کے اگلے سال 1145ھ کو آپ دوبارہ واپس دہلی آ گئے۔ پھر اپنے والد مرحوم کے مدرسے ''مدرسہ رحیمیہ'' میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے اور اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔

اولاد:

شاہ ولی اللہؒ کے چار بیٹے تھے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی۔ اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہیدؒ آپ کے پوتے تھے۔

کارنامے:

شاہ ولی اللہ نے بہت بڑا دعوتی، علمی، فکری اور تجدیدی کارنامہ سرانجام دیا۔ آپ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔ آپ کی تصانیف ان دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔ شعر و ادب کا عمدہ ذوق تھا۔

آپ کے کارنامے کے چند نمایاں پہلو یہ ہیں:

1۔ آپ نے مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور مسالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی

کوشش کی اور اعتدال کا مسلک اختیار کیا۔ لوگوں کے اختلافی مسائل میں اُلجھے رہنے کی بجائے اُن کو متفق علیہ اور اجماعی اُمور و مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص ملکہ عطا کیا تھا کہ آپ مختلف باتوں میں بھی مطابقت پیدا کر لیتے تھے۔

2۔ شاہ صاحب نے وقت کے تعلیمی نظام اور نصاب میں بھی دور رس تبدیلیاں اور اصطلاحات کیں۔ وہ طلبہ کو ابتداء ہی میں قرآن مجید کا لفظی ترجمہ پڑھا دینے کے قائل تھے۔ حدیث کی تعلیم بھی سادہ اور عام فہم انداز میں دینا پسند کرتے تھے۔ اُنہوں نے تمام دینی علوم کو قرآن و حدیث کے تابع کیا۔ وہ عقلی موشگافیوں اور باہمی اختلافات کے خلاف تھے۔

3۔ آپ نے زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والوں مسلمانوں کو دین کی دعوت دی اور اُن کے عقائد و اعمال اور اخلاق و کردار کی اصلاح میں کوشاں رہے۔ اقامتِ دین کا کام کیا۔ اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر پیش کیا اور انسانی زندگی کے اہم مسائل کا حل پیش کیا۔

4۔ آپ نے صحیح اسلامی ریاست کا تصور دیا اور اُسلام کے اُصولِ حکمرانی واضح کیے۔ حکمرانوں اور رعایا کے درمیان بہتر تعلق پر زور دیا۔

5۔ آپ نے اسلامی عقائد اور شریعت کے احکام کی حکمت و مصلحت کی ایسی عمدہ تشریح کی جو دل و دماغ کو اپیل کرتی ہے۔ دینی علوم اور تصوف کی ایسی تعلیم دی کہ بعد میں آنے والے اکثر دینی ادارے، صوفیانہ سلسلے اور اسلامی جہادی تنظیمیں اور تحریکیں آپ ہی سے فیض یاب تھے۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک مجاہدین بھی آپ کی تعلیمات کے زیرِ اثر تھی۔

6۔ شاہ صاحب نے علمی، تدریسی اور تصنیفی مصروفیات کے ساتھ ساتھ بدنظمی اور انارکی (Anarchy) کے اُس دور میں مسلمانوں کی یہ سیاسی خدمت سرانجام دی کہ اسلام کی حفاظت کے لیے اور مسلمانوں کو ہندو مرہٹوں کے مظالم سے بچانے کے لیے احمد

شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ جس نے 1761ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو شکست دے کر اُن کی کمر توڑ دی جس سے اُن کا ہندو حکومت کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

تصانیف:

شاہ صاحب نے قریباً تمام اسلامی موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، اصول، کلام، تصوف، تاریخ، سیرت اور شریعت کی حکمت پر بہت سی کتابیں لکھیں جن کی تعداد پچاس (50) کے قریب ہے۔

آپ کی چند اہم تصانیف یہ ہیں:

1۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ:

اس کا نام فتح الرحمٰن ہے۔ یہ قرآن مجید کا نہایت آسان فارسی زبان میں عمدہ اور مستند ترجمہ ہے۔

2۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر:

یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی۔ بعد میں اس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اس کے کئی اُردو تراجم بھی ہوئے۔

3۔ تاویل الاحادیث:

یہ کتاب عربی میں ہے۔ اس میں قرآن میں مذکور انبیائے کرام کے حالات و واقعات پر نہایت عمدہ اور بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے۔

4۔ المصفّٰی:

یہ کتاب مؤطا امام مالک کا فارسی ترجمہ و تشریح ہے۔

5۔ المسوّٰی:

یہ کتاب موطا امام مالک کی عربی شرح ہے۔

6۔ حجة الله البالغه:

یہ نہایت اہم کتاب عربی زبان میں ہے۔اس کی دو جلدیں ہیں۔اس کا اُردو ترجمہ ہو چکا ہے۔اس میں فقہ وشریعت کے احکام کی حکمتیں،تصوف کے مسائل اور بہت سی احادیث کی عمدہ تشریح ملتی ہے۔

7۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف:

یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔اس کے اُردو تراجم موجود ہیں۔اس کتاب میں اُمت کے اندر پیدا ہونے والے اختلافات کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مختلف مسالک میں اعتدال کی راہ اپنانے پر زور دیا گیا ہے اور فرقہ پرستی کی مذمت کی گئی ہے۔

8۔ عقد الجید فی احکام الاجتهاد و التقلید:

شاہ صاحب کا یہ رسالہ بھی عربی میں ہے۔اس کا اُردو ترجمہ حال ہی میں اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔اس کتاب میں اصول فقہ کے مباحث ہیں۔اجتہاد اور تقلید کے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ ہے اور اختلافی مسائل میں اعتدال کی روش اپنانے کی تاکید کی گئی ہے۔

9۔ ازالة الخفا عن خلافت الخلفاء:

یہ کتاب فارسی میں ہے۔اس کا اُردو ترجمہ دستیاب ہے۔اس کتاب میں خلفائے راشدین کی خلافت کے برحق اور درست ہونے کا اثبات ہے۔اس کے علاوہ اس کتاب میں اسلامی حکومت کے خدوخال بھی واضح کیے گئے ہیں۔

10۔ التفهيمات الالٰهيه:

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔اس کا اکثر حصہ عربی زبان میں ہے اور تھوڑا سا فارسی میں ہے۔اس کتاب میں مسلمانوں کے مختلف طبقات کو مخاطب کر کے اُن کو دعوت دی گئی ہے اور اُن کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔

11۔ البدور البازغه:

یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔اس کا بنیادی موضوع دین کی حکمت اور شریعت کے

اسرار و رموز ہیں۔

12۔ ھمعات :

یہ کتاب فارسی زبان میں تصوف کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔

13۔ سطعات:

یہ کتاب بھی فارسی زبان میں تصوف کے موضوع پر ہے۔

14۔ القول الجمیل:

یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور تصوف پر لکھی گئی ہے۔

15۔ الخیر الکثیر:

یہ کتاب بھی عربی میں ہے اور اس کا موضوع بھی تصوف ہے۔

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ شاہ صاحب کے بہت سے مکاتیب بھی ہیں جن میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ۔

باب 1

قرآن کے پانچ بنیادی علوم

1۔ تمہید:

اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو جن بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے اُن میں سب سے بڑی نعمت جو مجھے عطا ہوئی ہے وہ قرآن مجید کا علم وفہم ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے بھی ہم پر بڑے احسانات ہیں جن میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپؐ نے ہمیں قرآن حکیم کی دعوت وتبلیغ فرمائی۔

حضورؐ نے سب سے پہلے صحابہ کرام کو قرآن کی تعلیم دی۔ پھر صحابہ نے اپنے بعد آنے والی نسل کو قرآن سکھایا۔ اس طرح ہر نسل نے اپنے بعد آنے والی نسل تک قرآن پہنچایا۔ یہاں تک کہ اس کی روایت ودرایت میں سے اس فقیر کو بھی حصہ نصیب ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام کے بعد یہ فقیر جس کا نام ولی اللہ بن عبدالرحیم ہے، عرض کرتا ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب کے فہم کا دروازہ مجھ پر کھولا تو میں نے چاہا کہ بعض مفید معلومات اور نکات اس مختصر کتاب میں تحریر کر دوں۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ اس کتاب کے ذریعے طالب علموں کے لیے قرآن فہمی کی ایسی وسیع راہیں کھول دے گا جو موجودہ زمانے میں عمریں کھپانے کے باوجود لوگوں پر نہیں کھلتیں۔

میں نے اس کتاب کا نام ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' رکھا ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ

قرآنی علوم پنج گانہ:

قرآن مجید میں پانچ بنیادی علوم بیان ہوئے ہیں جن کو علوم خمسہ یا علوم پنج گانہ کہا جا سکتا ہے۔

(1)علمِ احکام:

اس علم میں فرض، واجب، مستحب، مباح، حرام اور مکروہ کی بحث ہوتی ہے اور اس کا دائرہ کار (Jurisdiction) عبادات، معاملات، معاشرت اور سیاست تک پھیلا ہوا ہے۔ایسے احکام کی تشریح کرنا فقیہ اور مجتہد کا کام ہے۔

(2)علمِ مخاصمہ (بحث و مباحثہ Debates):

اس علم کے مطابق قرآن میں چار (4) گمراہ فرقوں یعنی یہودیوں، عیسائیوں، مشرکین اور منافقین سے بحث و مباحثہ کیا گیا ہے۔اس علم کی تشریح کرنا متکلمین یعنی علم کلام کے ماہرین کے ذمے ہے۔

(3)علم تذکیر بآلاء اللہ:

اس علم کے لحاظ سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اُس کی نشانیوں کا ذکر ہے۔آسمان و زمین کی تخلیق کا بیان ہے۔انسان جس ہدایت اور تعلیم کا محتاج ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا تذکرہ ملتا ہے۔

(4)علم تذکیر بایّام اللہ:

یہ وہ علم ہے جس کا تعلق اُن تاریخی واقعات اور حالات سے ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔اس میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر اُس کے انعام کا اور نافرمانوں پر اس کے عذاب کا نازل ہونا بیان کیا گیا ہے۔

(5)علم تذکیر بالموت و ما بعد الموت:

اس علم کا تعلق موت اور آخرت کے احوال و واقعات سے ہے۔اس میں تفصیل کے

ساتھ حشر ونشر، حساب، میزان اور جنت و دوزخ کا ذکر ملتا ہے۔

اندازِ بیان (Style):

قرآن مجید میں ان علومِ خمسہ (پانچوں علوم) کو بیان کرنے کے لیے قدیم عربوں کا اسلوب (Style) اختیار کیا گیا ہے اور یہ اسلوب بعد کے عربوں کے ہاں نہیں ملتا۔

چنانچہ قرآن نے احکامی آیات کو مختصر انداز میں واضح کیا ہے، فقہاء کی طرح تفصیلات اور جزئیات بیان نہیں کیں۔

اسی طرح علم مخاصمہ کی آیات میں مخالفوں کے عقیدوں پر تقریری انداز میں کلام کیا ہے اور اُن سے فلسفیانہ اور منطقیانہ دلیلوں کے ساتھ بحث کا انداز نہیں اختیار کیا، جیسا کہ بعد کے لوگوں کا طریقہ ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ ضروری تھا اُسے عام ترتیب کی پروا کیے بغیر بیان کیا ہے۔

اسبابِ نزول:

اکثر مفسرین جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو خواہ اُس آیت کا تعلق احکام سے ہو یا مخاصمہ سے، وہ اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ چسپاں کر دیتے ہیں اور ایسے واقعے کو اُس آیت کا شانِ نزول قرار دیتے ہیں حالاں کہ قرآن کے نازل ہونے کا مقصد لوگوں کا تزکیۂ نفس اور اُن کے عقائد و اعمال کی اصلاح ہے۔ اِس لیے مختلف قسم کی آیتوں کا شانِ نزول بھی مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً:

1۔ علم مخاصمہ کی آیات کا شانِ نزول لوگوں کے غلط عقیدے ہیں۔

2۔ احکام کی آیتوں کا شانِ نزول لوگوں کے بُرے اعمال اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی ہے۔

3۔ علم تذکیر بآلاء اللہ، علم تذکیر بایام اللہ اور علم تذکیر بالموت والی آیتوں کا شانِ نزول یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے، اُس کی نشانیوں سے اور موت و آخرت سے

غافل ہیں۔

لیکن مفسرین حضرات شانِ نزول کے حوالے سے بعض چھوٹے چھوٹے غیر ضروری واقعات کی بہت زیادہ تفصیلات اور جزئیات بیان کر دیتے ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان کا قرآن کے مضامین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

البتہ بعض آیات ایسی ہیں جن میں کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ ملتا ہے، خواہ وہ واقعہ نبی ﷺ کے زمانے میں پیش آیا ہو یا آپؐ سے پہلے پیش آیا ہو۔ ایسی آیات کی تفسیر کرتے وقت اس سے متعلق واقعہ ضرور بیان کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر اس مقام پر ہر کسی کو تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

اب ہم علوم پنجگانہ کی ایسی تشریح کریں گے جس کے بعد شانِ نزول کی تفصیلات اور جزئیات بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

باب 2

آیاتِ مخاصمات (بحث ومباحثے کی آیتیں)

قرآن مجید میں چار گمراہ قوموں ...... مشرکین، منافقین، یہودیوں اور عیسائیوں سے بحث ومباحثہ کیا گیا ہے۔ اس بحث ومباحثے کے دو حصے ہیں:

1۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں اُن کے غلط عقیدوں کی تردید کی گئی ہے۔

2۔ دوسرے حصے میں اُن کے اعتراضات اور شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔

1۔ مشرکین کے عقائد:

مشرکین اپنے آپ کو حنیفی کہتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ دینِ ابراہیمی پر چلتے ہیں۔ حنیفی وہ ہے جو ابراہیمی دین کی پیروی کرے اور ابراہیمی طریقہ اختیار کرے۔ ابراہیمی طریقے میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں:

(1) خانہ کعبہ کا حج کرنا

(2) نماز میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنا

(3) جنابت کی حالت میں غسل کرنا

(4) ختنہ کرنا اور دوسرے فطری احکام کی پیروی کرنا

(5) حرمت والے مہینوں کا احترام کرنا

(6) مسجد حرام کا احترام کرنا

(7) نسب اور رضاعت سے حرام ہونے والی محرم عورتوں سے نکاح نہ کرنا

(8) جانوروں کو ذبح کر کے کھانا

(9) نحر کے طریقے سے اُونٹ کی قربانی کرنا

(10) اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے قربانی کرنا، خاص طور پر حج کے دنوں میں۔

اصل ابراہیمی دین میں یہ احکام بھی شامل تھے جن پر عمل کرنا نیکی اور بھلائی سمجھا جاتا تھا:

(1) وضو کرنا

(2) نماز پڑھنا

(3) سحری کے وقت سے لے کر سورج کے ڈوبنے تک روزہ رکھنا

(4) یتیموں اور مسکینوں کو صدقہ دینا

(5) مصیبت میں دوسروں کے کام آنا

(6) رشتہ داروں کی مدد کرنا

لیکن مشرکین کی اکثریت ان سب باتوں کو بھلا چکی تھی۔

اسی طرح قتل، چوری، زنا، سود اور ڈاکہ بھی دین ابراہیمی میں حرام تھا اور ان تمام چیزوں کو برا سمجھا جاتا تھا مگر مشرکین میں یہ سب برائیاں موجود تھیں اور وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے تھے۔ وہ شرک کرتے تھے، قیامت کو نہیں مانتے تھے، وہ نبوت و رسالت کے منکر تھے، اُن کے ہاں ظلم و زیادتی اور ہر قسم کی برائی عام تھی، جاہلیت کے بُرے رسم و رواج تھے، اُن میں سچی عبادت کی روح ختم ہو چکی تھی۔

اب ان تمام اُمور کی تشریح کی جاتی ہے۔

1۔ شرک:

اللہ تعالیٰ کی صفات کو دوسروں کی طرف منسوب کرنا شرک ہے۔ مثلاً:

1۔ کائنات میں کسی اور کے ارادے اور اختیار کا تصرف ماننا جیسے اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو "کُنْ" کہتا ہے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی دوسرے بھی کر

سکتا ہے۔

2۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور بھی غیب کا علم رکھتا ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور بھی شفا دے سکتا ہے۔

4۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس نفع ونقصان پہنچانے کا اختیار تسلیم کرنا۔

یہ سب مشرکانہ عقیدے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو غیر اللہ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

عرب کے مشرکین یہ تو مانتے تھے کہ اس کائنات کا خالق، منتظم اور مدبر صرف اللہ تعالیٰ ہے اور یہ کہ اُس کے ارادے اور فیصلے اٹل ہوتے ہیں مگر وہ ایسے شرک میں مبتلا تھے جس کا تعلق بندوں کے حالات سے ہے۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح کوئی بادشاہ اپنے کسی نائب یا افسر کو کسی علاقے میں بھیجتا ہے تو اسے بااختیار بنا کر بھیجتا ہے تاکہ وہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں اپنے رائے اور فیصلے سے سرکاری اُمور سرانجام دے سکے۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ ہر جگہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر خود توجہ نہیں دے سکتا، اس لیے وہ اپنے ماتحتوں کو اختیار دے دیتا ہے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں کام کریں۔ بادشاہ اپنے ماتحتوں کی سفارش بھی قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو خدائی صفات اور اختیارات عطا فرماتے ہے جن کی خوشنودی اور ناراضی کا اثر عام لوگوں پر پڑتا ہے۔ اس لیے عام لوگ ان خاص بندوں کا تقرب اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ بادشاہ حقیقی کے دربار میں پذیرائی ہو اور ان خاص بندوں کی سفارش سے اپنی حاجتیں اور مرادیں بھی پوری ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے بعض خاص بندوں کو سجدہ کرنا بھی جائز سمجھتے تھے۔ اُن کے نام پر جانوروں کی قربانی کرتے تھے۔ اُن کے ناموں کی قسمیں کھاتے تھے، اُن سے اپنی مرادیں مانگتے تھے، اُن کو خدائی اختیارات میں شریک مانتے تھے، انہوں نے خاص بندوں کی پوجا کے لیے پتھر، لکڑی، لوہے اور بعض دھاتوں کے بت بنا رکھے تھے۔ آگے

چل کر جاہلوں نے انہی بتوں اور مورتیوں کو چھوٹے چھوٹے خداؤں کا درجہ دے دیا اور اس طرح شرک کی گمراہی پھیل گئی۔

2۔تشبیہ:

تشبیہ سے مراد ہے انسانی صفات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا۔مشرکین کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔اللہ اُن کی سفارش قبول کرتا ہے، چاہے اُسے پسند ہو یا ناپسند، جیسا کہ بادشاہ اپنے درباریوں کی بعض باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی مان لیتے ہیں۔

اسی طرح جب مشرکین اللہ تعالیٰ کے علم، اُس کے سُننے اور دیکھنے کی صفات کا ذکر سنتے تو ان کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہتے بلکہ وہ اُن کو بھی انسانی علم اور انسان کے سننے، دیکھنے کی طرح خیال کرتے۔اس کے علاوہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اُس کے وجود کو بھی انسانی جسم کی طرح تصور کرتے جس کے قیام کے لیے خاص جگہ کا ہونا ضروری ہے۔

3۔تحریف:

تحریف کا مطلب یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد طویل عرصے تک ابراہیمی دین پر قائم رہی پھر بعثت نبوی سے تین سو برس پہلے عمرو بن لحی نامی ایک ملعون شخص پیدا ہوا جس نے اُن میں بت پرستی شروع کرادی۔اُسی نے بحیرہ، سائبہ، حام اور تیروں کے ذریعے فال گیری جیسی بدعتیں ایجاد کیں۔

مشرکین نے ان تمام رسوم ورواج کو اپنے باپ دادا کا طریقہ سمجھ کر اختیار کرلیا اور اس آباء پرستی کو اپنے حق میں ایک دلیل بنالیا۔

4۔عقیدہ رسالت وآخرت:

اگرچہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے ہاں بھی قیامت اور حشر ونشر کے عقیدے کا ذکر ملتا ہے لیکن اُسے اتنی وضاحت اور تفصیل سے نہیں بیان کیا گیا جیسے قرآن نے بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین اس عقیدے سے ناواقف تھے۔

اسی لیے عرب کے مشرکین اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو مانتے تھے لیکن چونکہ انبیاء کرام انسانی جسم اور انسانی صفات رکھتے تھے جو اُن کی نبوت کے جمال کا ایک حجاب اور پردہ ہوتا تھا اس لیے یہ لوگ اُن کے بارے میں شک وشبہ میں پڑ گئے۔ اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس مقصد کے لیے انبیائے کرام کو بھیجا۔ وہ قاصد اور قاصد کو بھیجنے والے میں مشابہت کے قائل تھے۔ اس لیے وہ نبوت اور رسالت کے صحیح عقیدے سے ناواقف تھے اور اُسے ایک ناممکن چیز سمجھتے تھے۔ اس بارے میں اُن کے فضول اور بے معنی اعتراضات تھے۔ مثلاً نبی کھانا کیوں کھاتا ہے، پانی کیوں پیتا ہے، اللہ نے انسانوں کی بجائے فرشتوں کو کیوں نبی نہیں بنایا، ہر شخص کے پاس الگ سے وحی کیوں نہیں آتی، غرض اس طرح کی بہت سی نامعقول باتیں تھیں جو اُن کا عقیدہ بن چکی تھیں۔

ایک مثال:

اگر آپ کو ان مشرکین کی صحیح حالت کا اندازہ کرنا ہو تو موجودہ زمانے کے عجمی جاہل عوام کو دیکھ لیں کہ اُن کے ہاں ولایت کا کیا تصور ہے۔ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پہلے زمانے میں بہت سے اولیاء اللہ ہوتے تھے لیکن اب وہ کہیں موجود نہیں۔ یہ لوگ قبروں اور آستانوں پر جاتے ہیں اور وہاں طرح طرح کے مشرکانہ اعمال کرتے ہیں اور ان میں بھی تشبیہ اور تحریف کے غلط تصورات پیدا ہو چکے ہیں۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ؛

”تم لوگ بھی پہلی گمراہ قوموں کی پیروی کرو گے۔“

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ قوموں کے غلط عقائد اور برے اعمال میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کا ارتکاب آج مسلمان نہ کر رہے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آفت سے محفوظ رکھے۔

رسولؐ کی بعثت:

صرف مشرکین ہی نہیں اُس وقت کی ساری دنیا گمراہی میں مبتلا تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے حضرت محمد ﷺ کو عرب کی سرزمین میں مبعوث فرمایا۔ آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ ابراہیمی طریقہ اختیار کر کے تبلیغ کریں۔ ساتھ ہی قرآن نے مشرکین سے بحث ومباحثہ کیا، جس میں اُن کے چند مسلمہ اُصولوں اور عقیدوں کو بنیاد بنا کر دلائل دیے جو ابراہیمی دین کا شعار تھے اور جو ابھی تک اُن میں باقی رہ گئے تھے، تا کہ اُن پر حجت تمام کر دی جائے اور وہ حقیقت کا انکار نہ کرسکیں۔

شرک کا جواب:

قرآن نے مشرکین عرب کے شرک کی تردید چار طریقوں سے کی ہے:

1۔ سب سے پہلے قرآن نے اُن سے اُن کے شرک کی دلیل مانگی ہے اور واضح کیا ہے کہ اُن کی یہ دلیل کہ یہ ہمارے باپ دادا کا عقیدہ ہے اس لیے ہم اس کی پیروی کرتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ بلکہ اُن کے آباء واجداد کا اصل عقیدہ توحید کا عقیدہ تھا جسے اب وہ بھلا چکے ہیں۔

2۔ قرآن نے یہ وضاحت بھی کی کہ جن بندوں کو وہ اللہ تعالیٰ کے شریک سمجھتے ہیں، اُن میں اور اللہ تعالیٰ میں کوئی برابری یا مشابہت نہیں ہے۔ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کسی اور کی عبادت جائز نہیں۔

3۔ قرآن نے یہ حقیقت بھی واضح کی کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء کرام توحید کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿25﴾ ﴾

”اور اے نبیؐ! ہم نے آپؐ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس کے پاس یہ

وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔''

4۔ قرآن نے واضح کر دیا کہ بتوں کی حیثیت انسان کے مقابلے میں بہت پست اور حقیر ہے۔ یہ انسانیت کی توہین ہے کہ وہ پتھر کے ٹکڑوں کو اپنا معبود اور خدا سمجھ کر اُن کی پوجا کرے۔

یاد رہے کہ یہ دلیل صرف اس قوم کو دی گئی جو بتوں کو خدائی کا درجہ دیتی تھی۔

تشبیہ کا جواب:

جو لوگ تشبیہ پر یقین رکھتے تھے اور انسانی صفات کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کرتے تھے اُن کو تین طرح سے جواب دیا گیا:

1۔ اُن سے اُن کے دعوے کی دلیل طلب کی گئی اور جب اُنہوں نے کہا کہ یہ اُن کے باپ دادا کا طریقہ ہے تو اس کے جواب میں اُن کو بتایا گیا کہ تمہارے باپ دادا کا اصل طریقہ توحید کا تھا، تشبیہ اور شرک کا نہ تھا۔

2۔ اُن کو سمجھایا گیا کہ اُن کے عقیدے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ باپ اور بیٹا ایک جیسے ہوں۔ جب کہ خالق اور مخلوق ایک جیسے نہیں ہیں تو وہ آپس میں برابر کیسے وہ گئے اور کوئی مخلوق اپنے خالق کی شریک کیسے بن گئی؟

3۔ اُنہیں سمجھایا گیا کہ جن چیزوں کو وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور معیوب سمجھتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کون سی عقل مندی ہے۔ تم اپنے لیے بیٹیوں کی پیدائش کو برا سمجھتے ہو مگر اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہو اور کہتے ہو کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿149﴾ ﴾

''اے نبیؐ! آپ مشرکین سے پوچھیں کہ کیا اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں اور اُن کے لیے بیٹے۔''

تحریف کا جواب:

مشرکین میں سے جو لوگ تحریف ہی کو اصل حقیقت سمجھے ہوئے تھے اُن کو قرآن نے دو طرح سے جواب دیا:

1۔ ایک یہ کہ اُن کے جو عقائد اور اعمال ہیں وہ اُن کی اپنی ایجاد ہیں۔ اُن کے باپ دادے کا طریقہ اُن سے بالکل مختلف تھا۔

2۔ دوسرے اُن کو آگاہ کیا گیا کہ وہ جن چیزوں کا اعتقاد رکھتے ہیں اصل میں اُن کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ وہ سب غیر معصوم انسانوں کی من گھڑت باتیں ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

حشر ونشر کے انکار کا جواب:

مشرکین کے اس تصور کو کہ حشر ونشر اور آخرت کوئی چیز نہیں ہیں، درج ذیل دلائل سے رد کیا گیا:

1۔ ایک دلیل یہ دی گئی ہے کہ دیکھو جس طرح خشک اور مردہ زمین بارش سے دوبارہ زندہ اور سرسبز وشاداب وہ جاتی ہے اسی طرح زندگی دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے اسی طرح وہ مردہ انسانوں کو بھی ایک دن زندہ کر دے گا۔

2۔ دوسری دلیل یہ دی گئی کہ تمام الہامی کتابیں رکھنے والی پہلی اُمتوں کا یہ متفقہ عقیدہ تھا کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد آخرت کی زندگی ہے اور تمام مذاہب کا اس عقیدے پر متفق ہونا ظاہر کرتا ہے کہ آخرت برحق ہے۔

رسالت کے عقیدے پر اعتراضات کے جوابات:

نبوت ورسالت کے بارے میں مشرکین نے جو اعتراضات کیے ہیں، قرآن میں اُن سب کے الگ الگ جوابات دیے گئے ہیں:

1۔ عقیدۂ رسالت پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ کوئی انسان نبی نہیں ہو سکتا۔ اس

کے جواب میں فرمایا گیا کہ پہلے کے تمام انبیائے کرام انسان ہی تھے:

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ ﴾ [النحل آیت:43]

''اور اے نبیؐ! ہم نے آپؐ سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ وَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا ؕ قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًۢا بَيۡنِىۡ وَ بَيۡنَكُمۡ ۙ وَ مَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴾

''اے نبیؐ! یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو۔ آپؐ کہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے، اور اُن لوگوں کی گواہی جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔''

2۔ دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی کہ نبوت و رسالت دراصل وحی کا نام ہے:

﴿ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ ﴾ [الکھف آیت:110]

''کہہ دیجیے میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں لیکن مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے۔''

پھر اس وحی کی تشریح یوں فرمائی گئی:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيۡمٌ ﴾ [الشوریٰ:51]

''کوئی انسان اس کی تاب نہیں لا سکتا کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر وحی کے ذریعے سے، یا پردے کے پیچھے سے، یا کسی فرشتے کو اس کے پاس بھیج دے

تا کہ اپنے حکم کے مطابق جو وحی چاہے کر دے۔ بے شک اللہ سب سے بلند اور حکمت والا ہے۔"

3۔ نبوت ورسالت کے بارے میں مشرکین کے بعض دوسرے اعتراضات یہ تھے:

(1) اُن کی فرمائش کے مطابق نبی ﷺ معجزے کیوں نہیں دکھاتے۔

(2) اُن کے کسی نامزد شخص کو نبی کیوں نہیں بنایا جاتا۔

(3) کسی فرشتے کو رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا۔

(4) الگ الگ ہر شخص پر وحی کیوں نہیں آتی۔

ان سب اعتراضوں کے جواب میں فرمادیا گیا کہ یہ سب کچھ ایک مصلحت کے تحت ہے، جس کو وہ اپنی نادانی کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتے۔

جوابات میں تکرار:

چونکہ نبی ﷺ کی بعثت مشرکین میں ہوئی تھی، اس لیے قرآن کی اکثر سورتوں میں نبوت ورسالت سے متعلق مضامین کو بار بار نئے انداز میں تاکید کے ساتھ دہرایا گیا ہے اور ان جاہلوں اور کم عقلوں سے اسی انداز میں کلام کرنا مناسب تھا۔

یہودیوں کے عقائد:

یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ توریت کو مانتے ہیں۔ مگر ان کی گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے توریت کے احکام بدل ڈالے تھے۔ یہ تبدیلی الفاظ میں بھی کی گئی اور معانی میں بھی کر دی گئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کی بہت سی آیتیں چھپا رکھی تھیں اور خود اپنی طرف سے آیتیں گھڑ کر اس میں شامل کر دی تھیں۔ وہ توریت کے احکام پر عمل نہیں کرتے تھے۔ اُن میں سخت مذہبی تعصب تھا۔ وہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا انکار کرتے تھے۔ وہ نہ صرف آپؐ کی شان میں بے ادبی، گستاخی اور طعنہ زنی کرتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی گستاخانہ کلام کرتے تھے۔ اُن میں دولت کی ہوس اور بخل جیسی اخلاقی خرابیاں پائی جاتی

تھیں۔

توریت میں تحریف:

یہودیوں نے توریت میں جو لفظی تحریف اور تبدیلی کی تھی وہ اُس کے ترجمے میں کی تھی۔ اس فقیر کے نزدیک یہی بات درست ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ معنوی تحریف و تبدیلی کا مطلب ہے غلط تشریح و توجیہ کرنا، یعنی زبردستی سیدھے راستے سے ہٹ کر کسی آیت کے وہ معنی مراد لینا جو اصل میں مراد نہ ہوں۔

(مترجم کو اس بات سے اختلاف ہے۔ میرے نزدیک یہودیوں نے توریت کے الفاظ اور معانی دونوں میں تبدیلی کی تھی۔)

معنوی تحریف کا انداز:

یہودیوں نے توریت میں جس انداز سے تحریف اور تبدیلی کی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ عام (General) حکم کو خاص (Specific) حکم میں تبدیل کر دیتے تھے۔ مثلاً: ہر مذہب میں فاسق اور کافر کا فرق موجود ہے اور بتایا گیا ہے کہ کافروں کے لیے سخت عذاب ہوگا اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، جبکہ فاسقوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ انبیائے کرام کی شفاعت کے ذریعے دوزخ سے نکالے جائیں۔ اس حقیقت کو ہر مذہب نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ توریت میں یہودیوں اور عبریوں کو، انجیل میں عیسائیوں کو اور قرآن میں مسلمانوں کو یہ درجہ دیا گیا ہے کہ وہ فاسق ہونے کے باوجود آخر کار اپنے ایمان کی بدولت جنت میں جائیں گے۔

لیکن یہودیوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ صرف یہودی اور عبری ہی جنت میں جائیں گے۔ انبیاء کی شفاعت بھی صرف اُنہی کے لیے ہوگی۔ اگر وہ دوزخ میں گئے بھی تو صرف چند دنوں سے زیادہ وہاں نہ رہیں گے۔ اُن کا ایسا سمجھنا جہالت اور حماقت ہے، خواہ اس کے ساتھ وہ اللہ پر، آخرت پر اور رسولوں پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کریں یا نہ کریں۔

قرآن کی وضاحت:

قرآن چونکہ پہلی تمام الہامی کتابوں پر نگران اور مہیمن ہے اور وہ ہر قسم کے شک وشبہ کو دُور کرتا ہے، اس لیے اس نے اس مغالطے کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ:

﴿ بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓــَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ج ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾ ﴾ [البقرہ:81]

''اصل بات یہ ہے کہ جس نے کوئی برائی کی اور اس کے گناہ نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تو ایسے لوگ دوزخ میں رہیں گے۔''

معنوی تحریک کی ایک غلط بنیاد:

انبیائے کرام نے دنیا کی تمام قوموں کو ایک ہی دین یعنی اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ لیکن ہر قوم کو شریعت الگ الگ دی گئی جو اس کے زمانے اور حالات کے مطابق تھی۔ اس کے علاوہ فروعی احکام و مسائل میں بھی اس قوم کے حالات، عادات اور مزاج کا خیال رکھا گیا تھا۔ ہر قوم کا دین مستقل تھا، لیکن شریعت عارضی تھی۔ جب تک کوئی نیا نبی نہ آئے پہلی شریعت پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن یہودیوں نے اس کا یہ مطلب لیا کہ اُن کی شریعت بھی مستقل ہے اور اُس کے احکام کبھی تبدیل یا منسوخ نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کو دین و شریعت کی پیروی کا حکم دیا جاتا ہے تو اس سے مراد ایمان اور نیک اعمال ہوتے ہیں۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ جو شخص بھی اس قوم کا فرد ہے وہ ضرور نجات پائے گا، خواہ وہ ایمان اور نیک اعمال سے خالی ہو۔

مگر یہودیوں نے یہی سمجھا کہ صرف یہودی قوم کا فرد ہی نجات پائے گا، اس کے لیے ایمان اور نیک اعمال ضروری نہیں۔

یہودیوں نے بعض الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بھی بدل ڈالے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے انبیائے کرام اور اُن کے نیک پیروکاروں کو

اپنا محبوب اور پسندیدہ قرار دیا ہے، جبکہ کافروں کو ناپسندیدہ اور مبغوض ٹھہرایا ہے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی وحی نے وہی الفاظ استعمال کیے ہیں، جو کسی قوم کے اپنے روز مرہ اور محاورے کے مطابق تھے۔ چنانچہ کسی موقع پر محبوب کے بجائے بیٹے کا لفظ استعمال کیا گیا اور یہ اس قوم کے روز مرے اور محاورے کے عین مطابق تھا۔ لیکن یہودیوں نے اس کا مطلب یہ لے لیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف انہی کو قرب حاصل ہے اور صرف وہی اس کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔

انہوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب صرف ان کو ملتا ہے جو اس پر ایمان لائیں اور اس کی فرماں برداری اختیار کریں۔

یہودیوں نے اس طرح کی بہت سی غلط تاویلیں کر کے دین و شریعت کے بارے میں ایک غلط تصور قائم کر لیا۔ لیکن قرآن نے ان کی ایسی تمام غلط فہمیوں کو دُور کر دیا۔

آیتوں کو چھپانا:

یہودی علماء نے توریت کی بعض آیتیں چھپا رکھی تھیں، جو اُن کے ذاتی مفادات کے خلاف تھیں۔ مثلاً توریت میں حکم تھا کہ زنا کے مجرم کو سنگسار کیا جائے، یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کیا جائے۔ لیکن یہودی علماء نے مل کر توریت کے اس حکم کو بدل ڈالا اور اس کی بجائے مجرم کو کوڑے مارنے اور اُس کا منہ کالا کر دینے، کی سزا مقرر کر لی اور وہ آیت چھپا دی جس میں سنگساری کی سزا دینے کا حکم تھا۔

اس سلسلے کی ایک اور مثال دیکھیے: توریت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ حضرت حاجرہ کی اولاد میں نبوت و رسالت کی بشارت موجود ہے اور ایک ایسی اُمت کی پیش گوئی ہے جو حجاز کی سرزمین میں غلبہ حاصل کرے گی، جس کی بدولت عرفات کی پہاڑیاں لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی صداؤں سے گونج اٹھیں گی اور وہاں دوسرے ممالک کے لوگ حج کے لیے آئیں گے۔

یہودیوں نے پہلے تو اس بشارت کا یہ مطلب بدلا کہ یہ محض ایک نئی امت کے آنے کی خبر ہے۔ اس کی پیروی اور اطاعت کرنے کا حکم نہیں ہے۔ وہ کہا کرتے تھے:((مَلْحَمَةٌ كُتِبَتْ عَلَيْنَا)) کہ" یہ مسلمان جو ہم پر غالب آرہے ہیں ان کا یہ غلبہ توریت میں بھی لکھا ہوا ہے۔"(گویا ہمارا مقدر یہی ہے۔) لیکن جب ان کی یہ تاویل نہ چل سکی تو وہ ان آیتوں کو چھپانے لگے جن میں اُمتِ مسلمہ کے بارے میں پیش گوئی موجود تھی۔ اس بارے میں قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا صلے ج وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ط أَفَلَا تَعْقِلُونَ (76) ﴾ [البقرہ:76]

" وہ کہتے ہیں:" کیا تم مسلمانوں کے سامنے وہ باتیں ظاہر کرتے ہو جو اللہ نے تمہیں بتائی ہیں، تاکہ وہ کل کو تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کریں؟ کیا تم نہیں سمجھتے؟"

اب اسے جہالت کہیے یا شرارت کہ یہودیوں نے اس پیش گوئی کو کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت حاجرہ کی اولاد میں نبوت رکھی گئی جائے گی اور ایک نئی اُمّت برپا ہوگی، اسے صرف ایک اطلاع اور خبر قرار دیا اور اس نبوت کی اطاعت اور امت مسلمہ کے طریقے کی پیروی کو ضروری نہ سمجھا۔

درحقیقت یہ اُن کی جہالت نہ تھی، بلکہ ان کی شرارت ہی تھی اور اُس اللہ پر اُن کا بہتان تھا جس نے توریت میں یہ پیش گوئی فرمائی تھی۔

من گھڑت شرارت:

یہودی علماء اپنی طرف سے بعض احکام گھڑ لیتے اور اُسے شریعت قرار دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک مصلحت کے تحت توریت کے احکامات کا مطلب بدل دینا جائز تھا۔ چنانچہ ان کی

من گھڑت اور خود ساختہ چیزیں اُن کی شریعت کا لازمی حصہ بن گئیں۔ جن کی پابندی ضروری ٹھہری۔ عوام اپنے علماء کی بات کو اٹل اور حرفِ آخر سمجھتے تھے اور اپنے علماء سے توریت کی دلیل نہیں پوچھتے تھے۔ اُن کے علماء اُن کے لیے جو چیز حلال یا حرام ٹھہراتے وہ اُسی پر عمل کرتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار بھی اُنہوں نے اپنی من گھڑت رائے کی بنیاد پر کیا تھا، ورنہ توریت میں اس انکار کے لیے کوئی دلیل موجود نہ تھی۔

توریت کے احکام پر عمل کرنے میں بھی یہودیوں نے لاپرواہی برتی، جس کے نتیجے میں اُن میں دولت کی ہوس اور بخل جیسے برے اخلاق پیدا ہوگئے۔ یہ ان کی خواہش پرستی اور نفس اَمّارہ کی پیروی تھی اور ظاہر ہے کہ:

﴿ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ ط (53) ﴾

[یوسف:53]

"بے شک انسان کا نفس تو بدی سکھاتا ہے اور اس سے صرف وہ بچ سکتا ہے جس پر میرا رب رحم فرمائے۔"

یہودیوں کی اسی خواہش پرستی اور اُن کی نسلی غرور نے ان میں ایک اور ہی ذہنیت پیدا کردی تھی۔ یہ ذہنیّت ان کی لیپا پوتی کی عادت اور غلط تاویلوں کی شکل میں ظاہر ہوئی، جسے انہوں نے مذہب کا مقدس نام دے رکھا تھا۔

یہودیوں نے نبوتِ محمدیؐ کا انکار کیوں کیا:

یہودیوں نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار درج ذیل وجوہات کی بنا پر کیا تھا:

1۔ انبیائے کرام کے حالات اور ان کے ماحول کا مختلف ہونا۔

2۔ انبیائے کرام کی بیویوں کی تعداد کا ایک جیسا نہ ہونا۔

3۔ انبیائے کرام کا ایک ہی دین ہونے کے باوجود اُن کی شریعتوں میں فرق ہونا۔

4۔ اللہ تعالیٰ کا مختلف نبیوں سے مختلف رویہ اختیار کرنا۔

5۔ حضورؐ سے پہلے جتنے انبیائے کرام مبعوث ہوئے ان کا تعلق زیادہ تر بنی اسرائیل سے ہونا جبکہ آپؐ بنی اسماعیلؑ میں سے تھے۔

انہی وجوہات کی بنا پر یہودیوں نے حضورؐ کی نبوت کا انکار کیا۔ حالانکہ یہ وجوہات ایسی نہ تھیں جن کی بنیاد پر آپؐ کی نبوت سے انکار کیا جاتا۔ کیونکہ نبی کا کام لوگوں کی اصلاح اور اُن کو عبادت کا صحیح طریقہ سکھانا ہے۔ اُس کا یہ کام نہیں کہ وہ خود نیکی اور برائی کے اصول ایجاد کرے۔

ہر قوم کا ماحول، اس کا مزاج، اس کی نفسیات اور اُس کے رسم و رواج مختلف ہوتے ہیں۔ جب کوئی نئے رسم و رواج اور تمدن شروع نہیں کرتا، بلکہ وہ ان سب چیزوں کا دینی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتا ہے۔ پھر جو چیز دین کے مطابق ہوتی ہے اسے باقی رکھتا ہے اور جو کچھ دین کے مطابق نہیں ہوتا، اس میں مناسب تبدیلی اور اصلاح کرتا ہے۔

اسی طرح ہر قوم کے لیے تذکیر بآلاء اللہ اور تذکیر بایام اللہ (جن کی تشریح پہلے گزر چکی ہے) کا اسلوب بھی اُس قوم کے مزاج، ماحول اور حالات کے مطابق ہوا کرتا ہے، جس کی وجہ سے اُن کی شریعتیں الگ الگ ہوجاتی ہیں۔

اس کی مثال اس طبیب کی سی ہے جو دو مختلف مریضوں کو مختلف دوائیں دیتا ہے۔ ایک مریض کے لیے سرد دوائیں اور سرد غذائیں تجویز کرتا ہے، اور دوسرے کے لیے گرم دوائیں اور گرم غذائیں استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہے، مگر دونوں صورتوں میں طبیب کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ مرض دور ہو اور مریض صحت یاب ہوجائے۔ یہ ممکن ہے کہ مختلف ملکوں کے ڈاکٹر اور طبیب اپنے ہاں مریضوں کے لیے ان کے مزاج کے موافق الگ الگ دوا اور غذا تجویز کریں۔ بلکہ موسم کی تبدیلی کے لحاظ سے بھی وہ مختلف مشورے دے سکتے ہیں۔

بلکہ یہی معاملہ طبیب حقیقی اللہ تعالیٰ کا ہے جس نے لوگوں کے روحانی امراض کا علاج کرنے کے لیے ان کے مزاج اور ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے مختلف طریقے اختیار کیے اور

الگ الگ شریعتیں مقرر کیں۔

اگر آج آپ ان علمائے یہود کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے اردگرد اُن علمائے سوء کو دیکھ لیں جو دنیا پرست ہیں۔ اپنے بزرگوں کی اندھی تقلید میں گرفتار ہیں۔ قرآن و سنت کے واضح احکام سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

کسی عالم یا فقیہ کے غلط اجتہاد اور قیاس کو سند اور معتبر قرار دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ جو کہ معصوم شارع ہیں، کی صحیح احادیث کی بالکل پروا نہیں کرتے، بلکہ جھوٹی حدیثوں اور غلط تاویلوں کو اپنا امام اور رہنما بنائے ہوئے ہیں۔

3۔ عیسائیوں کے عقائد:

دوسری طرف عیسائی قوم تھی، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان کا دعویٰ رکھتی تھی لیکن ان کی گمراہی یہ تھی کہ وہ خدا کو ایسی تین چیزوں کا مرکب قرار دیتے تھے، جو کبھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور کبھی تینوں ایک ہیں۔ اسے انہوں نے ''اقانیم ثلاثہ'' (Trinity) کا نام دے رکھا تھا۔ ان کے نزدیک ان میں سے ایک باپ ہے، جو خالق ہے، دوسرا بیٹا ہے جو سب سے پہلی مخلوق ہے اور تمام مخلوقات میں بھی شامل ہے۔ تیسرا روح القدس (Noly Ghost) ہے جس سے روحانی قوتیں مراد ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ بیٹے کی روح نے عیسیٰ علیہ السلام کی شکل اختیار کر لی۔ جیسا کہ جبرئیل علیہ السلام کبھی کبھی بشر کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام بیک وقت خدا، خدا کے بیٹے اور بشر ہیں۔ ان کی ذات میں خدا کی صفات اور انسانی اوصاف جمع ہو گئے ہیں۔ عیسائی علماء اپنے اس عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے انجیل کی بعض ایسی عبارتوں کا حوالہ دیتے ہیں، جن میں عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔ یا جن میں ان کے بعض ایسے کاموں کا ذکر ہے جو صرف خدا ہی کر سکتا ہے۔

عیسائی علماء عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ثابت کرنے کے لیے جس انجیل کا حوالہ دیتے ہیں،

اس میں خود اُن کے اپنے اعتراف کے مطابق اتنی تبدیلیاں ہوچکی ہیں کہ اُس کے بعد اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ موجودہ انجیل واقعی اصلی اور حقیقی ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی، پھر بھی بیٹے کے لفظ سے خدا کا بیٹا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ قدیم زمانے میں بیٹے کا لفظ محبوب، پیارے اور مقرب کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا اور یہاں بھی اس کے وہی معنی مراد ہیں۔ خود موجودہ انجیل میں بھی اس لفظ کے ان معنوں کی طرف واضح اشارات ملتے ہیں۔

عیسائی علماء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کی دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے بعض ایسے کاموں کو اپنی جانب منسوب کیا ہے جو صرف خدا ہی کرسکتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی خدا کی خدائی میں شریک اور اُس کے بیٹے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جن خدائی کاموں کو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، اس کی حیثیت ترجمانی اور نمائندگی کی ہے، جیسے کوئی سفیر یا ایلچی اپنے بادشاہ کے کاموں کو اپنی جانب منسوب کرکے یوں کہہ دیتا ہے کہ ہم نے فلاں ملک فتح کرلیا ہے اور فلاں قلعہ تباہ کردیا ہے۔ حالانکہ یہ سارے کام بادشاہ سے متعلق ہوتے ہیں اور سفیر یا ایلچی کی حیثیت بادشاہ کے محض ایک ترجمان یا نمائندے کی ہوتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر جو وحی آتی ہو وہ براہِ راست اُن کے دل پر اِلقاء ہوتی ہو، درمیان میں جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں آکر وحی نہ کرتے ہوں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام براہِ راست ان کے دل پر منعکس (Reflect) ہوتے ہوں اور اس صورتِ حال کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کا اندازِ گفتگو تبدیل ہوجاتا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے کاموں کو اپنی جانب منسوب کررہے ہوں۔

قرآن نے عیسائیوں کے اس غلط عقیدے، عقیدۂ تثلیث (Trinity) کی پرزور تردید کی ہے اور یہ حقیقت واضح کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے تھے۔ وہ اس کی طرف سے ایک روح تھی، جسے حضرت مریم علیہا السلام کے بطن میں پھونکا گیا تھا۔ عیسیٰ

علیہ السلام کو روح القدس یعنی جبرائیل علیہ السلام کی تائید حاصل تھی اور انہیں بعض خاص عنایات اور معجزات سے نوازا گیا تھا۔

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ خود ایک عام روح کی شکل اختیار کر کے عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، تو ایسا فرض کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کے بعد عبد اور معبود کا تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ اسے باہمی اتحاد (Union) کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ اسے تقویم (Structure) یا اس جیسا کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے، مگر یہ سب اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔

اگر آپ عیسائیوں کی اس گمراہی کا نمونہ مسلمانوں میں دیکھنا چاہتے ہیں تو بعض اولیاء اللہ اور بزرگوں کی اولاد کو دیکھ لیں، جنہوں نے اپنے باپ دادا کو کیا کیا درجے دے رکھے ہیں۔ یہ پیرزادے، صاحبزادے اور سجادہ نشین اپنے بزرگوں کو خدا تو نہیں کہتے، مگر وہ اپنے بزرگوں کے جو اوصاف بیان کرتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ میں پائے جاتے ہیں۔ عنقریب ایسے ظالم اپنے انجام کو پہنچیں گے۔

عیسائیوں کی ایک اور گمراہی یہ ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔ حالانکہ یہ ان کا مغالطہ ہے۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے (رفعِ عیسیٰ) کو غلط فہمی سے ان کا مقتول ہونا سمجھ لیا اور پھر اسی غلط عقیدے کا پرچار کرتے رہے۔

قرآن نے اس بارے میں واضح کیا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو قتل کیا اور نہ سولی دی، بلکہ وہ اس معاملے میں شبے میں پڑ گئے۔

موجودہ انجیل میں عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دیے جانے کے حوالے سے جو کلام خود عیسیٰ علیہ السلام کی جانب منسوب ہے، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ان کو شہید کیا گیا تھا۔ بلکہ اس سے یہودیوں کی اس ناپاک جسارت کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے اپنے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دے دی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام

کو یہودیوں کے شر سے محفوظ رکھا۔

پھر اسی واقعے سے متعلق عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا جو قول ملتا ہے اس کی بنیاد بھی ایک شبے اور مغالطے پر ہے کہ کوئی شخص آسمان کی طرف اٹھایا ہی نہیں جاسکتا، کیونکہ انہوں نے نہ ایسا کبھی سنا اور نہ دیکھا اور نہ ان کے خیال میں کبھی ایسا آیا۔ اس لیے حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کو ان کا قتل ہونا سمجھ لیا۔

اسی طرح انجیل میں جس فارقلیط (Paracletus-periclytos) کی آمد کی بشارت اور پیش گوئی ہے، اس کے بارے میں عیسائی گمراہی میں پڑ گئے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فارقلیط خود عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو سولی پانے کے بعد دوبارہ حواریوں کے پاس آئے اور آپ نے ان کو انجیل مقدس کی پیروی کی تلقین فرمائی۔

عیسائی یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ میرے بعد کئی جھوٹے مدعیانِ نبوت پیدا ہوں گے۔ پھر جو میرے نام سے دعوت دے اس کی باتیں قبول کر لینا اور جو میرے نام سے دعوت نہ دے اس کی بات نہ سننا۔

قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اس بشارت اور پیش گوئی کا مصداق، جو فارقلیط (Paracletus-periclytos) کے نام کی گئی تھی، حضرت محمد ﷺ کو قرار دیا ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کے روحانی صورت میں دوبارہ آنے کو تسلیم نہیں کیا۔ خود انجیل کا بیان ہے کہ آنے والا فارقلیط (Paracletus-periclytos) ایک مدت تک تمہارے درمیان قیام کرے گا۔ لوگوں کو علم سکھائے گا۔ ان کی اصلاح کرے گا۔ اور یہ سب باتیں حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی اور سے ظاہر نہیں ہوئیں۔ پھر مذکورہ پیش گوئی میں جو یہ کہا گیا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے گا تو اس سے مراد یہ ہے کہ آنے والا نبیؐ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی تصدیق کرے گا۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ انہیں خدا یا خدا کا بیٹا کہے گا۔

4۔ منافقین کے عقائد:

منافقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، لیکن

حقیقت میں مسلمان نہ تھے۔ ان کے دو گروہ تھے۔

1۔ منافقوں کا ایک گروہ وہ تھا جو زبان سے اسلام کا اقرار کرتا، لیکن ان کے دل میں کفر تھا۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج (145) ﴾

[النساء:145]

"بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے۔"

2۔ منافقوں کا دوسرا گروہ کمزور عقیدے کے ساتھ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ یہ لوگ اپنے قبیلے یا قوم کے تابعے تھے۔ جب ان کا پورا قبیلہ یا قوم مسلمان ہوگئی تو ان لوگوں نے بھی دل سے اسلام قبول کرلیا۔

اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل تھے، جو بالکل دنیا پرست اور نفسانی خواہشات کے پجاری تھے۔ عیش وعشرت میں پڑے ہوئے تھے اور ان کے دلوں میں اللہ اور رسولؐ کی محبت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

ان میں کچھ اور لوگ بھی تھے، جن کے دلوں میں لالچ، حسد، کینہ اور اس طرح کی دوسری بداخلاقیاں پائی جاتی تھیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ دعا، عبادت اور ایمان کی حقیقی لذت کا احساس کرسکیں، ان میں بعض ایسے تھے، جن کو اپنی معاش اور روزی کمانے ہی سے فرصت نہ تھی، وہ آخرت کی فکر کیا کرتے۔ ان کے دلوں میں حضورؐ کی نبوت و رسالت کے بارے میں کئی شکوک وشبہات تھے، مگر یہ لوگ اخلاقی جرأت نہ ہونے کے سبب صاف صاف اسلام کا انکار بھی نہیں کرتے تھے۔

منافقین کے شکوک وشبہات:

منافقین نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت کا انکار کیوں کیا؟ اس کے درج ذیل

اسباب تھے:

1۔ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ آپؐ کو اپنے جیسا ایک عام آدمی سمجھتے تھے، جو اُن جیسے بشری تقاضا رکھتا تھا۔ وہ یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ ایک انسان بھی نبی یا رسول ہو سکتا ہے۔

2۔ دوسرا سبب جس کے باعث منافقین نے حضورؐ کی نبوت کا انکار کیا یہ تھا کہ ان کے سامنے اسلام بھی اسی طرح پھیل رہا تھا اور مختلف علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو رہا تھا، جس طرح دنیا کے عام حکمران ملک فتح کرتے ہیں اور اپنے اقتدار میں اضافہ کرتے ہیں۔ منافقین کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ ایک نبی کے کام اور ایک عام بادشاہ کے کام میں فرق کر سکیں۔ ان کے ذہن میں نبی یا رسولؐ کا تصور بھی ایک بادشاہ کا تصور تھا۔ اس لیے حضورؐ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کی بجائے وہ اس بارے میں کئی شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے۔

پھر ان منافقوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے، جو اگرچہ مسلمان ہو چکے تھے، لیکن ان کے دلوں میں اپنے اُن قبیلوں اور خاندانوں کی محبت موجود تھی، جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، بلکہ کافر تھے۔ چنانچہ اپنی کافر برادری کی محبت ان منافقوں کو اس بات پر ابھارتی تھی کہ وہ اپنے کافر اور مشرک رشتہ داروں کی مدد کریں اور ان کے مفادات کے لیے کام کریں۔ وہ اس معاملے میں یہ پروا نہیں کرتے تھے کہ ان کے اس رویے سے اسلام کو کتنا نقصان پہنچتا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ان کا عملی اور اخلاقی نفاق تھا۔ جبکہ پہلے گروہ کا نفاق عقیدے کا نفاق تھا۔

حضورؐ کی وفات کے بعد کسی شخص کے نفاق کو جاننا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق علم غیب سے ہے اور کسی کے دل کا حال دوسرا آدمی نہیں جان سکتا۔

رہا عملی اور اخلاقی نفاق، تو یہ دنیا میں ہر زمانے میں موجود رہا ہے اور خاص طور پر

ہمارے زمانے میں اس کی کثرت ہے۔

درج ذیل حدیث میں اسی عملی نفاق کی طرف اشارہ ہے:

''جس شخص میں چار چیزیں ہوں وہ پکا منافق ہے۔ ایک یہ کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، دوسری یہ کہ جب وہ وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اور تیسری یہ کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے اور چوتھی یہ کہ وہ کسی سے جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔''

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی نشانیاں بیان کرکے ان کو بے نقاب کیا ہے۔ دونوں قسم کے منافقین کے برے اعمال اور برے اخلاق ظاہر کیے ہیں، تاکہ امت ان سے باخبر اور محتاط رہے۔

اگر آپ منافقین کے عملی نمونے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے زمانے کے حکمرانوں اور ان کے درباریوں کی محفل میں چلے جائیں جہاں وہ درباری اپنے بادشاہوں کی باتوں کو رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور شریعت پر ترجیح دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان منافقوں میں ایسے بھی تھے جو حضورؐ کی باتیں بھی سنتے تھے اور منافقت بھی رکھتے تھے اور ہمارے زمانے کے منافقوں میں جو رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور شریعت کا حکم معلوم ہو جانے کے بعد بھی اس کے خلاف چلتے ہیں، کوئی فرق نہیں ہے۔

اسی طرح عقلی علوم مثلاً فلسفہ اور منطق جاننے والے بھی منافقین کے گروہ میں سے ہیں، جن کے دلوں میں دین کے بارے میں بے شمار شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی آخرت کو بھلا چکے ہیں۔

لہٰذا جب قرآن کی تلاوت کے دوران میں جہاں منافقوں کا ذکر آئے تو یہ نہیں تصور کرنا چاہیے کہ یہ لوگ صرف ماضی کے دور میں پائے جاتے تھے، بلکہ درج ذیل حدیث کے مطابق ان کو اپنے ہی زمانے کے لوگوں کا حال سمجھنا چاہیے۔

((لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ ......)) [متفق علیہ، مشکوۃ ح:5361]

"ضرور تم اپنے سے پہلی قوموں کے طور طریقوں کی پیروی کرو گے......"

حقیقت یہ ہے کہ آج دین کے لیے کوئی مصیبت ایسی نہیں جس کا نمونہ پہلے پیش نہ آچکا ہو۔ لہٰذا تفسیر کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ قرآن کے بنیادی اصول و مقاصد بیان کیے جائیں۔ محض کہانیاں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہم نے اس کتاب میں چاروں گمراہ قوموں یعنی مشرکین، یہود، عیسائی اور منافقین کے عقائد و نظریات کا مختصر خاکہ پیش کر دیا ہے، جس سے ان شاء اللہ قرآنِ مجید کے علم مخاصمات (بحث و مباحثہ) والی آیات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

باب 3

علم تذکیر بآلاء اللہ

(اللہ کی نعمتوں اور نشانیوں کے ذریعے سمجھانے کا علم)

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن سارے جہان کے لوگوں کی اصلاح اور ہدایت کے لیے نازل ہوا۔ اس میں عربی اور عجمی، شہری اور دیہاتی کا کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے صرف ان نعمتوں اور نشانیوں کے ذریعے نصیحت اور تذکیر فرمائی ہے، جن کو اکثر لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں اور اس سے زیادہ امور پر بحث نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے، جس سے معمولی عقل و فہم رکھنے ورالا شخص بھی ان کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ان کو سمجھنے کے لیے فلسفے اور منطق میں مہارت ضروری نہیں۔

وجود باری تعالیٰ:

قرآن میں وجود باری تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا زیادہ ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کے ثبوت کے لیے بھی تفصیلات بیان نہیں ہوئیں۔ کیونکہ دنیا کی کسی صحت مند، معقول اور متوازن قوم نے آج تک خدا کی ہستی کا انکار نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات:

لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات کا معاملہ اتنا سادہ اور آسان نہ تھا۔ عام لوگوں کو علمی اور تحقیقی

انداز میں ان کے بارے میں کچھ سمجھایا نہیں جاسکتا۔ یہاں تک کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت بھی نہیں سمجھائی جاسکتی جو انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے سب سے زیادہ نمایاں اور فائدہ مند ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی اس کی صفات کو سمجھے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ قرآن نے عام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا تصور اس طرح دلایا ہے کہ ان کو چند ایسی اعلیٰ انسانی صفتوں سے تشبیہ دے دی ہے جن کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں (مثلاً یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں، اس کا چہرہ ہے وغیرہ) لیکن اس تشبیہ کے نتیجے میں لوگ غلط فہمی اور گمراہی کا شکار ہوسکتے تھے، جس کی اصلاح کے لیے ساتھ ہی یہ فرمادیا کہ:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝11 ﴾

[الشوریٰ:11]

"کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ یہ محض تشبیہات ہیں، اصل حقیقت نہیں ہے۔ اللہ کے دو ہاتھ ہیں، لیکن تمہارے ہاتھوں جیسے نہیں۔ اس کا چہرہ ہے، مگر وہ تمہارے چہروں جیسا نہیں۔

پھر بعض انسانی اوصاف ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں۔ اگر ان کو اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب کردیا جائے تو اس سے انسان شرک اور گمراہی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اولاد پیدا ہونا۔ رونا، دھونا، غمگین ہونا اور پشیمان ہونا وغیرہ۔ قرآن نے اس طرح کی بشری صفات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے منع فرمادیا ہے۔

دراصل اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم توقیفی ہے اور اس بارے میں عقل اور رائے کا کوئی دخل نہیں۔ اس لیے اس سے متعلق اپنی رائے سے کوئی بات کہنا ناجائز ہے۔

اللہ کی نشانیاں:

چونکہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں اور اُس کی نعمتوں میں سے صرف ان کا ذکر کیا ہے، جن کو شہری اور دیہاتی، عربی اور عجمی سب یکساں طور پر سمجھ سکتے تھے۔ اس

لیے اس نے ان روحانی نعمتوں کا ذکر نہیں کیا جو علماء اور اولیاء اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔
اسی طرح اس نے ان تمدنی وسائل اور عیش و عشرت کے سامانوں کا بھی ذکر نہیں کیا جو بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ مخصوص تھے۔ بلکہ قرآن نے جن موضوعات کو چنا وہ یہ تھے:

1۔ زمین و آسمان کی پیدائش۔

2۔ دن رات کا باری باری آنا۔

3۔ ہواؤں کی گردش۔

4۔ بادلوں سے پانی کا برسنا۔

5۔ بارش سے طرح طرح کے پھلوں اور اناج کا پیدا ہونا وغیرہ۔

اس طرح بعض مقامات پر انسان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے اس کی بعض کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر جب اس پر مصیبت آتی ہے تو خدا کو پکارنے لگتا ہے، لیکن جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے، تو پھر خدا کو بھول جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جلد باز ہے، ناشکرا ہے اور تنگ دل ہے وغیرہ۔

باب 4

علم تذکیر بایّام اللہ

ایام اللہ یعنی وہ تاریخی واقعات جب اللہ تعالیٰ کے بندوں پر انعام ہوا یا اس کے نافرمانوں پر عذاب آیا۔ اس سلسلے میں بھی قرآن نے صرف ان واقعات کو لیا ہے جن کو لوگ پہلے سے جانتے تھے، یا جن کے بارے میں انہوں نے کچھ سن رکھا تھا۔ جیسے قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود کے واقعات جن کو وہ اپنے باپ دادا سے سنتے آئے تھے۔ یا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انبیائے بنی اسرائیل کے حالات جن سے اہل عرب کو یہودیوں کے ذریعے جو وہاں صدیوں سے رہ رہے تھے، کچھ نہ کچھ خبر تھی۔

چنانچہ قرآن میں بار بار انہی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اور جن تاریخی واقعات سے اہل عرب بالکل بے خبر تھے، یا ان کے بارے میں بہت ہی کم سُن رکھا تھا۔ مثلاً: ایران اور ہندوستان کے تاریخی واقعات تو ان کو قرآن نے بیان نہیں کیا۔

قرآن اور قصہ گوئی:

جس طرح قرآن نے کسی نئے اور انوکھے واقعے کا ذکر نہیں کیا، اسی طرح کسی قصے کو اس کی تفصیلات سمیت مکمل طور پر بیان کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ اس نے چند قصوں کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، جس سے قرآن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور لوگوں کو ہدایت یا عبرت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس انداز سے واقعات بیان کرنے میں حکمت یہ تھی کہ عوام کو جب کوئی نیا اور عجیب وغریب قصہ تفصیل سے سنایا جائے تو وہ اس قصے کی دلچسپیوں

میں کھو جاتے ہیں، جس سے قصہ بیان کرنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

ایک مشہور عارف کا قول ہے:

"جب سے لوگوں نے تجوید کا علم سیکھا ہے، قرآن کی تلاوت میں خشوع و خضوع ختم ہو گیا ہے اور جب سے مفسّرین نے اپنی تفسیروں میں باریک نکتے اور غیر ضروری بحثیں شروع کی ہیں، اصل تفسیر باقی نہیں رہی۔"

اسی حقیقت کو قرآن نے تاریخی واقعات بیان کرتے وقت پیش نظر رکھا ہے۔ کیونکہ جب لوگ قصے کی دلچسپیوں میں مگن ہو جاتے ہیں تو قصے کا اصل مقصد کھو جاتا ہے۔

درج ذیل واقعات اور قصص ایسے ہیں جن کو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے:

1۔ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ:

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، فرشتوں کا آپ کو سجدہ کرنا، شیطان کا سجدہ کرنے سے انکار کر کے لعنت کا مستحق ہونا، آدم اور بنی آدم کو شیطان کی طرف سے گمراہ کرنے کی کوشش کرنے کا ذکر ہے۔

2۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا قصہ

3۔ حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کا قصہ

4۔ حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم کا قصہ

5۔ حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم کا قصہ

6۔ حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم کا قصہ

یہ تمام واقعات ایک جیسے ہیں، جن میں ہر پیغمبر کا اپنی قوم سے توحید، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں بحث و مباحثہ ہوا۔ ہر قوم نے نافرمانی کی اور فضول اعتراضات کیے جن کے جوابات پیغمبروں نے دیے۔ پھر ہر قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہونے اور انبیائے کرام اور ان کے پیروکاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرف و حمایت اور

عذاب سے نجات پانے کا ذکر ہے۔

7۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ:

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون اور اس کے درباریوں کے درمیان ہونے والے واقعات، فرعون کی قوم کا غرق ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے باہمی معاملات، بنی اسرائیل کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستانے کے واقعات، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر کئی قسم کے عذاب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت شامل ہیں۔

8۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ:

اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا خلیفہ فی الارض ہونا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بادشاہ بننا اور ان دونوں نبیوں کے معجزات کا ذکر ہے۔

9۔ حضرت ایوب علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ:

ان دونوں نبیوں کے قصے میں ان پر آزمائشوں کا ذکر ہے۔

10۔ حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ:

اس قصے میں حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہونے کا خاص واقعہ ہے۔

11۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عجیب و غریب قصہ:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا۔ آپ کا جھولے میں لوگوں سے کلام کرنا اور آپ کے عجیب و غریب معجزات شامل ہیں۔

قرآن مجید میں مذکورہ بالا قصے کہیں مختصر اور کہیں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

ایک دو دفعہ بیان ہونے والے قصے:

قرآن میں درج ذیل قصے صرف ایک دو بار بیان ہوئے ہیں:

1۔ حضرت ادریس علیہ السلام اوران کے آسمان پر اٹھائے جانے کا واقعہ

2۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مباحثہ اور ذبح کیے جانے والے پرندوں کا دوبارہ زندہ ہونا۔

3۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کیے جانے کا قصہ

4۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ

5۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، آپ کا دریائے نیل میں ڈالا جانا۔ جوان ہونا۔ ایک قبطی کو غلطی سے قتل کرنا۔ مدین کی طرف بھاگ جانا۔ مدین میں شادی۔ ایک درخت پر آگ کی روشنی دیکھنا اور اس درخت کے اندر سے باتیں سننا۔ گائے کے ذبح کا واقعہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خضر سے ملاقات اور طالوت و جالوت کا قصہ۔

6۔ بلقیس (ملکۂ سبا) کا قصہ

7۔ ذوالقرنین کا قصہ

8۔ اصحابِ کہف کا قصہ

9۔ باغ والوں کا قصہ

10۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین قاصدوں کا قصہ جن کو شہید کردیا گیا تھا۔

11۔ اصحابِ فیل (ہاتھی والوں) کا قصہ

مذکورہ بالا تمام قصص و واقعات کے بیان کرنے کا مقصد محض قصہ گوئی یا کہانیاں سنانا نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کی طرف توجہ دلائی جائے کہ شرک، نافرمانی اور گناہ کرنے والوں پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے اور سچے ایمان والوں اور فرماں برداروں کو ہمیشہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے تائید و نصرت اور عذاب سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

باب 5

علم تذکیر بالموت و ما بعد الموت

قرآن مجید میں موت اور موت کے بعد کے واقعات کا علم بھی موجود ہے۔ اس میں انسان پر موت کی حالت طاری ہونے، اس وقت انسان کے بے بس ہو جانے، مرنے کے بعد اس کو جنت یا دوزخ دکھائے جانے اور عذاب کے فرشتوں کے آنے کا ذکر ملتا ہے۔

اس کے علاوہ قیامت کی نشانیوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا، دجال کا ظاہر ہونا، یاجوج ماجوج کا نکلنا، صور پھونکا جانا، لوگوں کا حشر کے میدان میں جمع ہونا، اعمال کا حساب ہونا، میزان قائم ہونا، دائیں یا بائیں ہاتھ میں اعمال ناموں کا ملنا، ایمان والوں کا جنت میں داخل ہونا اور کافروں کا دوزخ میں بھیجا جانا مذکور ہے۔ (مترجم کے نزدیک قرآن مجید میں دجال کا کوئی ذکر نہیں۔)

پھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دوزخ میں عام لوگوں اور اُن کے رہنماؤں اور پیشواؤں کے درمیان ایک کب جھگڑا ہوگا؟ وہ ایک دوسرے پر الزام لگائیں گے۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہیں گے۔ مومنوں کو جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ کافروں کو کس طرح کا عذاب دیا جائے گا۔ عذاب کے لیے زنجیروں، طوق، کھولتے ہوئے پانی، پیپ اور زقوم (تھوہر) کے درخت کا ذکر ہے۔ جنت کی نعمتوں میں حوروں، محلات، نہروں، پسندیدہ کھانوں، عمدہ لباس، حسین و جمیل عورتوں اور اہل جنت کی دلچسپ باتوں اور محفلوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ تمام چیزیں مختلف سورتوں میں الگ الگ مقامات پر کہیں مختصر اور کہیں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ لیکن ہر مقام پر کبھی اختصار اور کبھی تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ لیکن ہر جگہ نیا اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔

باب 6

علم احکام

قرآن مجید کے علم احکام کا سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت ملتِ ابراہیمی کے تناظر میں ہوئی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ آپ ملتِ ابراہیمی کے ضروری احکام اور تعلیمات کو باقی رکھیں، ان کو علاقائیت سے نکال کر عالمگیریت (Universality) کا رنگ دیں اور ان کی تکمیل کے لیے ان میں مزید اضافہ کریں۔

اس حوالے سے دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت یہ تھی کہ حضرت محمد ﷺ کے ذریعے پہلے عربوں کی اصلاح کی جائے۔ پھر ان کے ذریعے باقی قوموں کی اصلاح کا کام ہو۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شریعتِ محمدیہ کے احکام کی بنیاد عربوں کے مزاج اور عادات پر رکھی جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ملتِ ابراہیمی کے احکامات اور اہل عرب کے رسم و رواج کو دیکھا جائے اور پھر شریعتِ محمدیہ کے احکام پر غور کیا جائے جو دراصل پہلے دونوں کی اصلاح اور تکمیل کا نام ہے تو ہمیں شریعت اسلامیہ کے ہر حکم کا سبب معلوم ہو جائے گا اور ہر امر اور نہی کی مصلحت بھی واضح ہو جائے گی۔

اس نکتے کی حکمت اور وضاحت تفصیل چاہتی ہے، لیکن مختصر طور پر اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ملت ابراہیمی کی عبادات مثلاً طہارت، نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور ذکر الٰہی جیسے اُمور میں بے شمار نقائص اور خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، جن کی وجہ سے لوگوں کی ان احکام

پر عمل میں غفلت اور لاپروائی تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ صحیح علم نہ ہونے کے باعث ان احکام کے بارے میں عربوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوچکے تھے اور ان میں جاہلیت کی بہت سی بدعات اور تحریفات شامل ہوچکی تھیں۔

قرآن نے ان تمام ناہمواریوں کو دُور کرکے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔

پھر چونکہ عربوں کا معاشرتی نظام بھی بگڑ چکا تھا اور اس میں غلط رسم ورواج نے راہ پا لی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے سیاسی نظام میں بھی خرابیاں پیدا ہوچکی تھیں۔ اس لیے قرآن نے ان سب چیزوں کی اصلاح کی۔ ان کے اصول وضوابط مقرر کیے اور اس حوالے سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا۔

قرآن نے نماز کے مسائل مختصر اور اجمالی طور پر بیان کیے ہیں اور " اقامة الصلوٰة " یعنی نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حکم کی روشنی میں مساجد کی تعمیر فرمائی۔ باجماعت نماز کا اہتمام کیا اور نماز کے اوقات مقرر فرمائے۔

اسی طرح قرآن میں زکوٰۃ کا حکم بھی مختصر طور پر دیا گیا ہے، جس کی تفصیلات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

قرآن کی مختلف سورتوں میں الگ الگ احکام کا ذکر ہے۔ مثلاً سورۂ البقرہ میں روزے اور حج کا حکم ہے۔ اسی طرح جہاد کا حکم سورۂ البقرہ، سورۂ الانفال اور بعض دوسری سورتوں میں مذکور ہے۔ حدود کے احکام سورۂ المائدہ اور سورۂ النور میں آئے ہیں۔ وراثت کے احکام سورۂ النساء میں بیان ہوئے ہیں اور طلاق کے متعلق احکام سورۂ البقرہ، سورۂ النساء اور سورۂ الطلاق میں ملتے ہیں۔

مذکورہ تمام احکام کا فائدہ عام ہے اور ان کا تعلق پوری امت سے ہے۔

ان کے علاوہ ایسے احکام بھی ہیں جو لوگوں کے ان سوالوں کے جواب میں قرآن نے بیان کیے ہیں، جو مختلف اوقات میں حضوؐر سے کیے گئے تھے۔

پھر قرآن میں ایسے حالت و واقعات بھی ملتے ہیں جن میں اہل ایمان کے ایثار اور اُن کی جانی و مالی قربانیوں کی تعریف کی گئی ہے اور ایسے موقع پر منافقین کے رویے کی مذمت کی گئی ہے۔

اسی طرح عہد نبوی کے ان حالات کا ذکر ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ ان کا تذکرہ کرتے وقت اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں پر اپنی نعمتوں اور اپنے احسانات کو بھی بیان فرمایا ہے۔ بعض حالات ایسے بھی پیش آئے جب مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی۔ یا اشاروں کنایوں میں ان کو سمجھایا گیا۔ یا جب ان کو کسی کام کے کرنے کا یا نہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ایسے تمام مواقع پر اللہ تعالیٰ نے آیتیں نازل کی ہیں۔ لہٰذا ایک مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے مقامات پر متعلقہ واقعات کو بھی مختصر طور پر بیان کر دے۔

قرآن اور غزواتِ نبویؐ:

قرآن نے عہد نبوی کے بعض غزوات کا بھی اشارے کنائے سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورۂ الانفال میں غزوۂ بدر کا، سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کا، سورۂ الاحزاب میں غزوۂ خندق کا اور سورۂ الفتح میں صلح حدیبیہ کا اور سورۂ الحشر میں یہودیوں کے بنی نضیر کا تذکرہ موجود ہے۔

اسی طرح سورۂ التوبہ میں فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کا، سورۂ المائدہ میں حجۃ الوداع کا، سورۂ الاحزاب اور سورۂ التحریم میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کا، سورۂ النور میں واقعۂ اِفک کا، سورۂ الجن اور سورۂ الاحقاف میں جنات کے قرآن سننے کا اشارہ ملتا ہے۔ سورۂ التوبہ میں مسجد ضرار کا اور سورۂ بنی اسرائیل میں معراج کے واقعے کا ذکر ہے۔

مذکورہ بالا تمام واقعات اگرچہ تذکیر بایام اللہ کے علم سے متعلق ہیں، لیکن ان کے اشارات کا سمجھنا، چونکہ اصل قصوں کو جاننے پر منحصر ہے، اس لیے ہم نے اسے الگ بیان کر دیا ہے۔

لہٰذا ایک مفسر کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی تمام آیات کی تفسیر میں متعلقہ قصص و واقعات کو بھی بیان کرے۔

باب 7

قرآن فہمی کی مشکلات اور اُن کا حل

قرآن مجید عربوں کی زبان میں نازل ہوا۔ انہیں اس کے سمجھنے کا قدرتی سلیقہ حاصل تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ ﴾ [الدخان:1،2]

"حا،میم۔ قسم ہے واضح کتاب کی۔"

ایک جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٢ ﴾ [یوسف:2]

"بے شک ہم نے یہ عربی قرآن اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١ ﴾ [هود:1]

"الف، لام، را۔ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں محکم اور مفصّل ہیں۔ یہ ایک دانا اور باخبر ذات کی طرف سے ہے۔"

پھر چونکہ رسول اللہ ﷺ کی یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ متشابہ آیات کے بارے میں زیادہ کھوج کرید کریں۔ یا اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں دقیق فلسفیانہ بحثیں کریں۔ یا تاریخی واقعات اور قصص کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا جائے۔ لہٰذا ان اُمور کے بارے میں

لوگوں کی طرف سے بہت کم سوالات آئے اور ان کو زیادہ تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا گیا۔

لیکن جب اسلام کا پہلا دور گزر گیا اور دوسرے دور میں عجمی اثرات اس میں داخل ہوئے تو اصل عربی زبان سے دُوری ہوگئی، جس کی وجہ سے قرآن کو سمجھنے میں دشواریاں پیش آنے لگیں، جس کے حل کے لیے لغت اور صرف ونحو جیسے علوم کی ضرورت پڑی۔

پھر اس حوالے سے سوال و جواب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تفسیریں لکھی جانے لگیں۔ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے اُن مقامات کو واضح کیا جائے، جن کو سمجھنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ پھر ان کی مثالیں بیان کی جائیں، تاکہ لوگ جب قرآن پر غور کریں تو اُن کو کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

قرآن فہمی میں دشواری کا بنیادی سبب:

قرآن کے بعض مقامات کو سمجھنے میں اس لیے مشکل پیش آتی ہے کہ وہاں استعمال ہونے والا کوئی لفظ ہمارے لیے نامانوس ہوتا ہے اور چونکہ لفظ کا صحیح مفہوم معلوم نہیں ہوتا اس لیے پوری آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کے زمانے میں اس لفظ کے کیا معنی تھے۔ جب یہ معلوم ہوجائے گا تو آیت کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔

قرآن فہمی کی راہ میں رکاوٹ کا دوسرا سبب یہ ہے کہ کبھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی آیت ناسخ ہے اور کون سی منسوخ؟ اس علم کو نہ جاننے سے بعض جگہ آیتوں کے مضامین میں تضاد (Contradiction) نظر آتا ہے اور صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔

اسی طرح کبھی شانِ نزول نہ جاننے سے کسی آیت کا صحیح مطلب سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

کبھی کسی جگہ کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے، خواہ وہ مضاف ہو، موصوف ہو یا کچھ اور ہو۔ اس حذف کی وجہ سے بھی آیت کا مضمون واضح نہیں ہوتا۔

بعض اور اسباب بھی ہیں، جن سے قرآن فہمی میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ ان اسباب کا تعلق صرف ونحو اور علم بیان سے ہے۔ ان سے ناواقفیت بھی قرآن فہمی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ مثلاً ایک لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے، یا ایک حرف کو کسی دوسرے حرف سے، یا ایک فعل کو کسی دوسرے فعل سے، یا ایک اسم کو کسی دوسرے اسم سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔

بعض اوقات واحد کی جگہ جمع اور جمع کی جگہ واحد آجاتا ہے۔ کہیں حاضر اور مخاطب کے لیے غائب کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ کہیں الفاظ کی تقدیم وتاخیر ہوتی ہے۔ کہیں کسی ضمیر کے اسم یا مرجع کا پتہ نہیں چلتا۔ کبھی ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوتے ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس جگہ کون سی معنی مراد ہیں۔ پھر کہیں تکرار، کہیں تفصیل، کہیں اختصار، کہیں اشارے کنائے، کہیں متشابہ اور کہیں مجاز مرسل کی وجہ سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

لہٰذا قرآن کے طالب علموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے ان تمام باتوں کو جان لیں اور ان کی مثالیں دیکھ لیں تاکہ ہر مشکل مقام کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

1۔قرآن کے مشکل الفاظ کی وضاحت:

قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی بہترین تشریح وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ابن ابی طلحہ نے روایت کی ہے۔ امام بخاری نے غالباً اسی پر اعتماد کرکے اسے روایت کیا ہے۔

اس کے بعد مشکل الفاظ کی دوسری تشریح وہ ہے جسے ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تیسری تشریح وہ ہے جو نافع بن ازرق کے سوالوں کے جواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے۔

امام سیوطی نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں قرآن کے مشکل الفاظ کی ان تینوں تشریحات کا ذکر کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک تشریح وہ بھی ہے جسے امام بخاری نے مفسرین سے نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شرح وہ بھی ہے، جسے صحابہ، تابعین اور تابعین کے زمانے کے اقوال سے مرتب کیا گیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے آخر میں ان تمام شرحوں کو سورتوں اور آیتوں کے شانِ نزول سمیت جمع کردوں۔ یا اسے ایک الگ مستقل رسالہ بنادوں۔ (شاہ صاحبؒ نے اسے ایک الگ رسالے کے طور پر لکھا تھا۔) تاکہ جو چاہے ان دونوں کو اکٹھا کرلے یا الگ الگ رکھے، کیونکہ ہر شخص کا اپنا ذوق اور طریقہ ہے۔

یاد رہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے کے مفسرین عام طور پر لفظ کے مرادی معنی بیان کرتے ہیں۔ بعد کے مفسّرین نے الفاظ کے مختلف لغوی معنی بیان کرکے علم لغت کو بہت وسعت دی ہے۔ ہم اپنے رسالے میں صرف سلف صالحین کے تفسیری اقوال بیان کریں گے، ان پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیونکہ اس کا یہ موقع نہیں اور ہر بات موقع پر اچھی لگتی ہے۔

2۔ ناسخ ومنسوخ آیات:

فہم قرآن کے لیے جن مشکل مقامات پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور جن کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ناسخ ومنسوخ آیات کی پہچان ہے۔

اس حوالے سے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ قدیم مفسرین اور بعد کے مفسرین کی اصطلاحوں میں فرق ہے۔ اگر صحابہ اور تابعین کے اقوال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''نسخ'' (منسوخ ہونا) کا لفظ اس کے اصل لغوی معنی میں استعمال کرتے تھے۔ یعنی'' ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے ہٹا دینا۔'' بعد کے علمائے اصول نے ''نسخ'' کی ایک نئی اصطلاح بنائی، جس کے معنی یہ قرار دیے کہ'' ایک آیت کے حکم کو کسی دوسری آیت کے حکم سے بدل دینا۔''

چنانچہ اس نئی اصطلاح کے تحت نسخ کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں:

1۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی حکم کی انتہائی مدت مقرر کردی جائے اور اس مدت کے بعد وہ حکم خود بخود ختم ہو جائے۔

2۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آیت کے ظاہری مفہوم کو کسی دوسرے مفہوم کی طرف پھیر دیا جائے۔ اس صورت میں پہلے مفہوم کو منسوخ سمجھا جائے گا۔

3۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آیت کے کسی حکم میں مذکور شرط کے بارے میں یہ وضاحت کردی جائے کہ یہ لازمی شرط نہیں ہے۔

4۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ کسی عام (General) حکم کو خاص (Specify) کردیا جائے۔

5۔ پانچواں طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایسا نکتہ بیان کیا جائے، جس سے آیت کے اصلی حکم کے مفہوم میں اور اس آیت کے الفاظ سے بظاہر پیدا ہونے والے غلط مفہوم کا فرق واضح کیا جائے۔

6۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ جاہلیت کے کسی رسم و رواج یا پہلی شریعتوں کے کسی حکم کو ختم کردیا جائے۔

یہ اور اس طرح کے کئی اور طریقے ہیں، جن سے کسی آیت کے حکم کو دوسرے حکم سے منسوخ سمجھا جاتا ہے۔

سلف صالحین کے نزدیک منسوخ آیات کی تعداد:

صحابہ کرام، تابعین اور سلف صالحین کے دور میں "نسخ" کے لفظ کو جن موقعوں کے لیے استعمال کیا گیا، اس سے اس لفظ کے معنی میں بہت وسعت پیدا ہوگئی اور اس میں عقل اور رائے کا عمل دخل شامل ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں منسوخ آیتوں کی تعداد کے بارے میں اختلافات پیدا ہوگئے۔

ان تمام اختلافات کو سامنے رکھا جائے تو منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو (500)

سے بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں۔

متاخرین کے نزدیک منسوخ آیات کی تعداد:

سلف صالحین کے بعد متاخرین علماء نے ''نسخ'' کا لفظ جن معنوں میں استعمال کیا ہے اور اسے ایک نئی اصطلاح بنادیا ہے اس کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہوجاتی ہے۔ اس بارے میں جو رائے ہم نے اختیار کی ہے اس کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد صرف چندرہ جاتی ہے۔

امام سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب '' الاتقان ''میں ابن عربی کے حوالے سے منسوخ آیات کی تعداد بیس (20) بتائی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ تعداد اور بھی کم ہوسکتی ہے۔

ابن عربی کے نزدیک منسوخ آیات اور ان پر تبصرہ:

اب ہم ابن عربی کے نزدیک منسوخ آیات کا ذکر کرکے ان پر تبصرہ کریں گے:

1۔ ابن عربی نے سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت کو منسوخ قرار دیا ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ج حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (180) ﴾ [البقرہ:180]

''جب تم سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ یہ ایک ذمہ داری ہے اللہ سے ڈرنے والوں کی۔''

پھر انہوں نے اس آیت کا حکم منسوخ ہونے کے بارے میں تین اقوال پیش کیے ہیں:

1۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ آیت ''آیاتِ مواریث'' (وراثت کے احکام والی آیتوں) سے منسوخ ہے۔

2۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وارث کے حق میں وصیت منع کرنے والی حدیث نے اس آیت

کے حکم کو منسوخ کردیا ہے۔ (لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔ مترجم۔)

3۔ تیسرے قول کے مطابق اس آیت کو اجماع نے منسوخ کیا ہے۔

میرے نزدیک اس آیت کی ناسخ مندرجہ ذیل آیت ہے:

﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ (11) ﴾

[النساء:11]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ وراثت میں ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا جائے۔''

مذکورہ وصیت والی حدیث اس آیت کے حکم کو منسوخ نہیں کرتی، بلکہ اس نسخ کی وضاحت کرتی ہے۔

(2) سورۂ البقرہ کی آیت:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ (184) ﴾

[البقرہ:184]

''اور جن لوگوں کے لیے روزہ رکھنا دشوار ہو وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا دیں۔''

اس آیت کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اسے درج ذیل آیت نے منسوخ کیا ہے:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ (185) ﴾ [البقرہ:185]

''پھر جو کوئی تم میں سے مقیم ہو تو وہ روزہ رکھے۔''

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہے۔

میرے نزدیک اس آیت کے حکم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس آیت کے مطابق جو لوگ کھانا کھلانے کی طاقت رکھتے ہیں، ان پر فدیہ واجب ہے۔ فدیے سے مراد مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ مرجع (اسم) سے پہلے ضمیر اس لیے لائی گئی کہ وہ اس سے زیادہ اہم ہے

اور ضمیر کو مذکر اس لیے لائے کہ فدیے سے مراد طعام (کھانا) ہے جو مذکر ہے۔ اس جگہ طعام سے مراد صدقہ فطر ہے، کیونکہ روزے کے حکم کے ساتھ ہی صدقہ فطر کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کے بعد والی آیت سے نماز عید کی تکبیریں مراد ہیں:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿185﴾ ﴾

[البقرہ:185]

''اور تا کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، جس نے تمہیں ہدایت بخشی اور تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔''

3۔ سورۂ البقرہ کی درج ذیل آیت کو بھی منسوخ کہا گیا ہے:

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ط ﴿187﴾ ﴾

[البقرہ:187]

''تمہارے لیے روزے کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کیا گیا ہے۔''

یہ آیت درج ذیل آیت کی ناسخ مانی گئی ہے:

﴿ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ط ﴿183﴾ ﴾ [البقرہ:183]

''جیسے پہلے لوگوں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔''

کیونکہ اس آیت میں جو مشابہت (کَمَا) دی گئی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ روزہ فرض ہونے کے علاوہ روزے کے احکام بھی پہلی شریعتوں کے عین مطابق ہوں اور جو کام روزے کی حالت میں پہلے منع تھے، ان کو اب بھی حرام سمجھا جائے۔ مثلاً سونے کے بعد کھانا حرام ہے، یا جیسے بیوی سے صحبت حرام ہے۔ لہٰذا اس آیت کے ذریعے اس آیت کا حکم منسوخ ہو جاتا ہے، جس میں ماہِ رمضان کی راتوں میں بیویوں سے صحبت کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ بات ابن عربی نے لکھی ہے اور انہوں نے دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ سنت نے اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آیت میں پہلی شریعتوں سے روزے کی جو مشابہت ہے اس کا

تعلق صرف روزے کی فرضیت سے ہے۔ گویا جس طرح پہلی شریعتوں میں روزہ فرض تھا، اسی طرح شریعتِ محمدیہ میں بھی روزہ فرض ہے۔ اس مشابہت کا روزے کے دوسرے مسائل واحکام سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا اسے پہلی آیت کا ناسخ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تو محض عربوں کو روزے کے فرض ہونے کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی بات ہے۔ اس کے سوا ہمیں سنت میں بھی ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی، جس سے اس آیت کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہو۔

اگر بالفرض سنت سے اس کا منسوخ ہونا ثابت ہو جائے۔ پھر بھی آیت کا قرآن سے منسوخ ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

4۔ سورۃ البقرہ کی یہ آیت بھی منسوخ سمجھی گئی ہے:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ط ..... (217) ﴾

[البقرہ: 217]

''اے نبیؐ! لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے میں لڑنا کیسا ہے؟''

اور اسے درج ذیل آیت کے حکم سے منسوخ مانا گیا ہے:

﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ط (36) ﴾

[التوبہ: 36]

''اور تم سب مل کر مشرکین سے جنگ کرو، جیسے وہ سب مل کر تم سے جنگ کرتے ہیں۔''

منسوخی کا یہ قول امام ابن جریر طبری نے عطاء بن میسرہ سے نقل کیا ہے۔

لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس آیت سے حرمت والے مہینوں میں قتال یعنی جنگ کرنے کا حرام ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ جنگ کرنے کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ ایسا اسلوبِ بیان ہے، جس میں کسی سبب کو مان لیا جاتا ہے۔ پھر اس کے راستے میں پیش آنے والی کسی رکاوٹ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حرام مہینوں میں جنگ کرنا بہت بڑا گناہ ہے، لیکن کفر اور شرک کا فتنہ اس سے بھی بڑا سخت جرم ہے، جس

کی روک تھام کے لیے حرام مہینوں میں بھی جنگ جائز ہے اور یہی تفسیر آیت کے سیاق و سباق (Context) کے لحاظ سے درست معلوم ہوتی ہے۔

5۔ سورۂ البقرہ کی یہ آیت بھی منسوخ قرار دی گئی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ج وَّصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ج ﴿240﴾ ﴾ [البقرہ:240]

''اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور ان کی بیویاں ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک انہیں گھر میں رکھ کر خرچ دیا جائے۔''

اس آیت کو درج ذیل آیت کے حکم سے منسوخ مانا گیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ج ﴿234﴾ ﴾ [البقرہ:234]

''اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیواؤں کو چار مہینے دس دن کی عدت گزارنی چاہیے۔''

اس طرح بیوہ کے لیے ایک سال کی مدت کے حکم کو چار مہینے دس دن کی عدت کے حکم سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اور وصیت کے حکم کو وراثت کے احکام والی آیات سے منسوخ مانا گیا ہے۔ البتہ بیوہ کی رہائش کے بارے میں حکم بعض علماء کے نزدیک منسوخ ہے اور بعض کے نزدیک منسوخ نہیں ہے۔ جو علماء اسے منسوخ قرار دیتے ہیں وہ لَا سُکْنٰی (رہائش نہیں ہے) والی حدیث کو اس کا ناسخ مانتے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک بھی دوسرے تمام مفسرین کی طرح یہ آیت منسوخ تو ہے لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت کے مطابق مرنے والے کی طرف سے ایسی کوئی وصیت کرنا جائز اور مستحب ہے۔ البتہ بیوہ کے لیے اس آیت کے حکم کی پابندی ضروری نہیں۔ یہی رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے اور یہ تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے درست

معلوم ہوتی ہے۔

6۔ سورۂ البقرہ کی درج ذیل آیت کو بھی منسوخ کہا گیا ہے:

﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ط فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (184) ﴾ [البقرہ:284]

''اور تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔''

مذکورہ آیت کو درج ذیل آیت سے منسوخ مانا گیا ہے:

﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط (286) ﴾ [البقرہ:286]

''اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

لیکن میرے نزدیک پہلی آیت کا حکم عام ہے اور دوسری آیت میں اسے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں '' مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ''(جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔) سے دل کا اخلاص مراد ہے یا دل کا نفاق، اور یہ دونوں مستقل حالتیں ہیں۔ اس سے دل میں پیدا ہونے والے ایسے وسوسے اور خیالات مراد نہیں ہیں، جن پر انسان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ جن باتوں پر انسان کو کوئی اختیار نہ ہو اُن کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

7۔ سورۂ آل عمران کی یہ آیت بھی منسوخ قرار دی گئی ہے:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (102) ﴾ [آل عمران:102]

''اے ایمان والو! اللہ سے ایسے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنا چاہیے اور مرتے دم تک اسی کی فرماں برداری کرو۔''

اور اسے درج ذیل آیت سے منسوخ مانا گیا ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ط (16) ﴾ [التغابن:16]

"پس تم اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔"

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ محکم ہے۔ البتہ سورۂ آل عمران کی اگر کسی آیت کے حکم کو منسوخ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہی آیت ہے۔

لیکن میری رائے میں " حَقَّ تُقَاتِهٖ "(جیسے ڈرنے کا حق ہے۔) سے شرک، کفر اور اسی طرح کے دوسرے غلط عقیدے مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عقیدے پر کسی قسم کا سمجھوتہ (Compromise) نہ کیا جائے۔ اور دوسری آیت میں جو مَا اسْتَطَعْتُمْ (جتنا تم سے ہو سکے) آیا ہے، تو اس کا تعلق عقیدے سے نہیں ہے، بلکہ اعمال سے ہے۔ مثال کے طور جو وضو نہیں کر سکتا وہ تیمّم کر لے۔ جو کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا وہ بیٹھ کر پڑھ لے۔

یہ ایسی توجیہ اور تفسیر ہے، جس کی تائید درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿102﴾ ﴾ [آل عمران:102]

"اے ایمان والو! اللہ سے ایسے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنا چاہیے اور مرتے دم تک اسی کی فرماں برداری کرو۔"

لہٰذا میرے نزدیک دونوں آیتیں اپنی جگہ مستقل اور محکم ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ناسخ یا منسوخ نہیں ہے۔

8۔ سورۂ النساء کی درج ذیل آیت کو بھی منسوخ کہا گیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿33﴾ ﴾ [النساء:33]

"اور جن لوگوں سے تم نے کوئی عہد کر رکھا ہو تو انہیں ان کا حصہ دو۔ بے شک اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔"

اور اسے درج ذیل آیت سے منسوخ مانا گیا ہے:

﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ

اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿75﴾ [الانفال:75]

''اور خون کے رشتہ دار اللہ کے قانون کے مطابق ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

لیکن میرے نزدیک آیت کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے وراثت صرف حقیقی وارثوں کے لیے ہیں، لیکن جو لوگ کسی معاہدے کے تحت موالی (ساتھی) بنتے ہیں وہ وراثت میں سے حصہ نہیں پا سکتے۔ البتہ ان سے حُسنِ سلوک کیا جائے گا۔ لہٰذا ان آیتوں میں نسخ کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

9۔ سورۃ النساء کی یہ آیت بھی منسوخ سمجھی گئی ہے:

﴿ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿8﴾ ﴾ [النساء:8]

''اور جب ترکہ تقسیم ہو اور بعض غریب رشتہ دار، یتیم اور محتاج بھی وہاں آ موجود ہوں تو اس میں سے انہیں بھی کچھ دے دو اور ان سے ہمدردی کی بات کہو۔''

اس آیت کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک کے مطابق یہ منسوخ ہے اور دوسرے کے مطابق یہ منسوخ نہیں ہے، مگر لوگ اس پر عمل کے بارے میں غفلت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہے، لیکن اس کا حکم فرض نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے۔ میرے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے ہی درست ہے۔

10۔ سورۃ النساء کی درج ذیل آیت کو بھی منسوخ کہا گیا ہے:

﴿ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿15﴾ ﴾

[النساء:15]

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدکاری کریں تو ان پر اپنے میں سے چار گواہ طلب کرو۔ پھر اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھو۔ یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا ان کے لیے کوئی اور راستہ نکالے۔''

کہا جاتا ہے کہ مذکورہ آیت سورۂ النور کی درج ذیل آیت سے منسوخ ہے:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ص ﴿2﴾ ﴾

[النور:2]

''زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو (100) کوڑے مارو۔''

لیکن میرے نزدیک مذکورہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ یہ آیت پہلی آیت کے تکمیلی مقصد اور اس میں کیے گئے وعدے کے پورا ہونے کو بیان کرتی ہے۔ لہٰذا اسے بھی منسوخ نہیں ماننا چاہیے۔

11۔ سورۂ المائدہ کی اس آیت کو بھی منسوخ کہا گیا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴿2﴾ ﴾

[المائدہ:2]

''اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینوں کی۔''

کہا جاتا ہے کہ مذکورہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے جس میں حرام مہینوں میں بھی جنگ جائز ہونے کا حکم ہے۔ (مصنف مرحوم کا اشارہ غالباً اس آیت کی طرف ہے:

﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص ﴾

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے بدلے میں ہے اور تمام حرمتوں میں ادلے کا بدلہ ہے۔ پھر جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے برابر زیادتی کرو۔''

میں کہتا ہوں مذکورہ آیت کو منسوخ کرنے والی کوئی آیت ہمیں قرآن میں نہیں ملتی اور نہ سنت سے اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل ملتی ہے۔ اس لیے آیت کے معنی یہ ہیں کہ

ایسی جنگ جو منع ہو وہ حرام مہینوں میں اور زیادہ ممنوع ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ:

''تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو اسی طرح محترم ہے جس طرح آج کا دن، یہ مہینہ اور یہ شہر محترم ہے۔''

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے دنوں میں، یا دوسرے مقامات پر مسلمانوں کا جان و مال محترم نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر حال میں محترم ہے، لیکن ان دنوں اور اس شہر میں اس کی حرمت اور بھی زیادہ ہے۔

12۔ سورۂ المائدہ کی درج ذیل آیت کو بھی منسوخ کہتے ہیں:

﴿ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ج ﴿42﴾ ﴾

[المائدہ:42]

''اے نبیؐ! اگر وہ آپؐ کے پاس آئیں تو آپؐ اُن کے درمیان فیصلہ کریں یا اُن کو ٹال دیں۔''

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت درج ذیل آیت سے منسوخ ہے:

﴿ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ط ﴿49﴾ ﴾ [المائدہ:49]

''اور اے نبیؐ! آپؐ اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کریں۔''

لیکن میرے نزدیک دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب آپؐ ذمیوں کے کسی مقدمے کا فیصلہ کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کریں اور ان لوگوں کی خواہش کی پروا ہرگز نہ کریں۔ غرض یا تو آپؐ غیر مسلموں کے معاملات کا فیصلہ ان کے اپنے بڑوں پر چھوڑ دیں کہ وہ اپنے دستور کے مطابق اس کا فیصلہ کریں یا اگر ہم ان کا فیصلہ کریں گے تو اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں سے نہ کوئی ناسخ ہے اور نہ منسوخ ہے، بلکہ یہ دو مختلف حالتوں کے لیے الگ الگ احکام ہیں۔

13۔ سورۃ المائدہ کی ایک اور آیت جسے منسوخ سمجھا گیا وہ یہ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ ﴿106﴾ ﴾

[المائدہ:106]

''اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور وہ وصیت کرنا چاہے تو اس کے لیے تم میں سے دو عادل مسلمان گواہ ہوں یا دو غیر مسلم گواہ ہونے چاہئیں۔''

اور اس کی ناسخ درج ذیل آیت بتائی گئی ہے:

﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ط ﴿2﴾ ﴾

[الطلاق:2]

''اور اپنے میں سے دو معتبر گواہ بنا لو۔ اور اللہ کے لیے ٹھیک گواہی دو۔''

میں کہتا ہوں کہ امام احمدؒ نے آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے اسے منسوخ قرار دیا ہے، لیکن دوسروں کے نزدیک یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کی تشریح کرتی ہیں۔ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو ایسے آدمی گواہ ہوں جو تمہارے رشتہ دار نہ ہوں اور تمام مسلمانوں میں سے کوئی بھی دو مرد گواہ ہو سکتے ہیں، جبکہ دوسری آیت میں مِنْكُمْ (تم میں سے) تمام مسلمان مراد ہیں۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تضاد (Contradiction) نہیں اور یہاں پر نسخ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

14۔ سورۃ الانفال کی اس آیت کو بھی منسوخ کہا گیا ہے:

﴿ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ج وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿65﴾ ﴾

[الانفال:65]

''اگر تم بیس (20) ثابت قدم ہو تو دوسو (200) پر غالب آ جاؤ گے۔ اور اگر

تم سو(100) ہو تو ایک ہزار(1000) پر غالب آسکتے ہو، کیونکہ کافر لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔"

اور اس کے بعد والی آیت کو اس کا ناسخ مانا گیا ہے جو یہ ہے:

﴿ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ط فَاِنْ يَّكُنْ مِّنكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ج وَاِنْ يَّكُنْ مِّنكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (66) ﴾ [الانفال:66]

"اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا کیونکہ اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ لہٰذا اگر تم میں سے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

15۔ سورۃ التوبہ کی یہ آیت بھی منسوخ قرار دی گئی ہے:

﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط (41) ﴾ [التوبہ:41]

"نکلو خواہ تم نہتے ہو یا مسلح اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔"

اور اس کی ناسخ درج ذیل دو آیتیں بتائی جاتی ہیں:

(1) ﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ط (17) ﴾ [الفتح:17]

"البتہ اندھے، لنگڑے اور بیمار پر کوئی گناہ نہیں ہے۔"

(2) ﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ط (91) ﴾

[التوبہ:91]

"جہاد میں شرکت نہ کرنے سے کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر جنہیں خرچ

میسر نہیں ہے، کوئی گناہ نہیں ہے، جبکہ وہ پیچھے رہ کر بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی خیر خواہی کریں۔"

چونکہ مذکورہ دونوں آیتیں ان لوگوں کو مستثنیٰ (Exception) کر دیتی ہیں جو معذور ہیں، اس لیے پہلی آیت کا حکم منسوخ سمجھا گیا۔ لیکن میرے نزدیک یہ حکم منسوخ نہیں ہے، کیونکہ اس کا تعلق جہاد کے سازوسامان سے ہے، افراد سے نہیں ہے۔ خِفَافًا (ہلکے) اس کم سے کم جنگی سامان کو کہا جاتا ہے جو میسّر آسکے۔ جیسے سواری کے جانور اور رسد یعنی کھانے پینے کی چیزیں اور خدمت گار وغیرہ۔ اسی طرح ثِقَالًا (بوجھل) سے مراد زیادہ سے زیادہ خدمت گار لوگ اور زیادہ سے زیادہ سواری کے جانور ہیں۔ جن دو آیتوں کو مذکورہ آیت کے حکم کا ناسخ ما! گیا ہے ان کا تعلق معذور افراد سے ہے۔ لہٰذا یہ آیتیں پہلی آیت کے حکم کی ناسخ نہیں ہوسکتیں۔ کم سے کم یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں جس چیز کو منسوخ کہا گیا ہے وہ متعین نہیں ہے۔

16۔ سورۂ النور کی یہ آیت بھی منسوخ قرار دی گئی ہے:

﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ز وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ج وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿3﴾ ﴾

[النور:3]

"بدکار مرد کسی بدکار عورت یا مشرک عورت ہی سے تعلق رکھتا ہے اور بدکار عورت کسی بدکار یا مشرک مرد ہی سے تعلق رکھتی ہے، لیکن ایمان والوں کے لیے ایسے تعلقات قائم کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔"

اور ابن عربی نے اس کی ناسخ آیت یہ نقل کی ہے:

﴿ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَ اِمَائِکُمْ ط ﴿32﴾ ﴾

[النور:32]

"اور تم میں سے جو بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دو۔ اور تمہارے غلاموں اور

لونڈیوں میں سے جو نکاح کے لائق ہوں ان کا بھی نکاح کر دو۔''

میرے نزدیک امام احمدؒ نے یہاں بھی آیت کا صرف ظاہری مفہوم لیا ہے، کیونکہ دوسروں کے ہاں یہ منسوخ نہیں ہے اور وہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کرنے والے کے لیے بدکار عورت ہی ہم کفو (Matching) ہو سکتی ہے، یا اس کے لیے ایسی عورت ہی سے نکاح بہتر ہے۔

لیکن دوسری آیت میں حُرِّمَ (حرام کیا گیا) کا لفظ آیا ہے اور اس کا تعلق زنا اور شرک دونوں سے ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جس آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا گیا ہے، تو اس کا حکم عام ہے اور ایک عام حکم سے کسی خاص حکم کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

17۔ سورۂ النور کی درج ذیل آیت کو بھی منسوخ مانا گیا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ ﴿58﴾ ﴾

[النور:58]

''اے ایمان والو! تمہارے غلاموں اور نابالغ بچوں کو تین وقتوں میں اجازت لینی چاہیے۔''

اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء اسے منسوخ سمجھتے ہیں اور بعض منسوخ نہیں سمجھتے اور وہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس کے حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے منسوخ نہیں کہا ہے اور آپ کا قول ہی اس بارے میں زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ اس کے حق میں زیادہ مضبوط دلائل ہیں۔

18۔ سورۂ الاحزاب کی اس آیت کو بھی منسوخ کہتے ہیں:

﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ ۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

﴿ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ﴿52﴾ ﴾ [الأحزاب:52]

”اے نبیؐ! آج کے بعد اور عورتیں آپؐ کے لیے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپؐ ان کی جگہ دوسری بیویاں کرلیں، اگرچہ ان کی صورت آپؐ کو اچھی لگے۔ البتہ مملوکہ عورتیں جائز ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔“

اور اس کی ناسخ آیت یہ بتائی جاتی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ ط ﴿50﴾ ﴾ [الاحزاب:50]

”اے نبیؐ! ہم نے آپؐ کے لیے وہ بیویاں حلال ٹھہرائی ہیں جن کے مہر آپؐ دے چکے ہیں۔“

مگر میرے نزدیک اس آیت کے بارے میں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ جس آیت کو ناسخ کہا گیا ہے وہ پہلے نازل ہوئی ہو۔ لہٰذا اس میں بھی نسخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

19۔ سورۂ المجادلہ کی اس آیت کے حکم کو بھی منسوخ قرار دیا گیا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ط ﴿12﴾ ﴾ [المجادله:12]

”اے ایمان والو! جب تم رسولؐ سے کوئی رازدارانہ بات کرو تو پہلے کچھ صدقہ دو۔“

ابن عربی کے نزدیک اسے بعد والی اس آیت نے منسوخ کیا ہے:

﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ط فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ ط...... ﴿13﴾ ﴾ [المجادله:13]

”کیا تم ڈر گئے اس حکم سے کہ نبیؐ سے اپنی رازدارانہ باتیں کرنے سے پہلے صدقہ دینا پڑے گا؟ اب اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ نے تمہیں معاف کیا۔......“

اس بارے میں میری رائے بھی وہی ہے جو ابن عربی کی ہے۔

20۔ سورۂ الممتحنہ کی یہ آیت بھی منسوخ سمجھی جاتی ہے:

﴿ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۭ ﴿11﴾ ﴾

[الممتحنه:11]

''تو جن مسلمان شوہروں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہوں، ان شوہروں کو اتنی رقم ادا کردو جوان کے خرچ کیے ہوئے مہر کے برابر ہو۔''

ایک قول کے مطابق یہ آیت درج ذیل آیتِ سیف سے منسوخ ہے اور دوسرے قول کے مطابق اسے درج ذیل آیت غنیمت سے منسوخ مانا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ محکم ہے۔ میرے نزدیک یہ آیت محکم تو ہے، لیکن اس کا حکم عام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق ایسے وقت سے ہے جب مسلمان کمزور ہوں اور کفار طاقتور ہوں۔

21۔ سورۂ المزمل کی یہ آیت بھی منسوخ قرار دی گئی ہے:

﴿ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿2﴾ ﴾ [المزمل:2]

''اے نبیؐ! رات کا کچھ حصہ نماز میں کھڑے ہو کر گزاریں۔''

کہا جاتا ہے کہ اس آیت کو اسی سورت کی آخری آیت نے منسوخ کر دیا ہے، اور یہ پنج وقتہ نماز کے حکم سے منسوخ ہوگئی ہے۔ لیکن میرے نزدیک اسے پنجگانہ نمازوں سے منسوخ قرار دینا صحیح نہیں۔ دراصل اس سورہ کے شروع میں جو قیام اللیل (رات کو قیام کرنا، عبادت کرنا) کا حکم ہے وہ ایک مستحب کام کی تاکید ہے۔ آخری آیت میں اس کی صرف تاکید منسوخ ہوئی ہے، اس کا مستحب ہونا منسوخ نہیں ہوا، وہ ابھی باقی ہے۔

امام سیوطیؒ نے ابن عربیؒ سے اتفاق کرتے ہوئے مذکورہ بالا اکیس (21) آیتوں کو منسوخ تسلیم کرلیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بھی بعض آیتوں کے منسوخ ہونے میں اختلاف ہے۔ لیکن ان آیات کے سوا اور کسی آیت میں نسخ واقع ہونے کا دعویٰ درست نہیں۔

میرے نزدیک قرآن میں منسوخ آیات کی تعداد صرف پانچ (5) ہے۔

3۔ شانِ نزول (اسبابِ نزول)

قرآن فہمی کی دوسری مشکل اسبابِ نزول یعنی شانِ نزول ہے۔ گویا یہ جاننا کہ کون سی سورت یا آیت کب اور کس موقع پر نازل ہوئی۔ اس دشواری کی وجہ یہ ہے کہ شانِ نزول کے لیے جو اصطلاح استعمال کی گئی اس کے معنوں میں سلف صالحین اور بعد کے لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔

سلف صالحین اور شانِ نزول:

سلف صالحین کے نزدیک شانِ نزول کے بیان کے لیے نَزَلَتْ فِیْ کَذَا. یعنی ''یہ سورت یا آیت اس بارے میں نازل ہوئی'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ صحابہ و تابعین کے زمانے میں یہی اصطلاح بعض دوسرے موقعوں کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس اصطلاح کو صرف نبی کریم ﷺ کے زمانے میں پیش آنے والے کسی ایسے واقعے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے، جو کسی آیت کے نازل ہونے کا سبب ہوتا تھا، بلکہ وہ اس اصطلاح کو ان واقعات پر بھی چسپاں (Apply) کر دیتے تھے، جو حضورؐ کے عہد مبارک کے بعد پیش آئے۔ اس طرح وہ ایک ہی آیت یا سورت کے کئی کئی شانِ نزول بنا دیتے تھے اور اس سے ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ اس آیت کے حکم کا اطلاق (Application) چونکہ فلاں فلاں واقعے پر بھی ہوتا ہے اس لیے وہ واقعہ بھی اس کا سبب نزول یا شانِ نزول ہے۔

کبھی ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کوئی سوال کیا جاتا، یا آپؐ کے مبارک زمانے میں کوئی واقعہ پیش آتا اور اس وقت حضورؐ قرآن کی کسی آیت سے کوئی حکم نکالتے اور بعض اوقات اس کی تلاوت بھی فرما دیتے تو اسے بھی کسی آیت کے شانِ نزول

قرار دیا جاتا۔ ایسے موقع کے لیے صحابہ کرام یوں کہہ دیتے کہ:

((نَزَلَتْ فِيْ كَذَا))

"یہ فلاں کے بارے میں نازل ہوئی۔"

یا یوں بیان کرتے کہ:

((فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَوْلَهٗ كَذَا))

"تو اللہ تعالیٰ نے فلاں کے بارے میں اپنا کلام نازل کیا۔"

یا کبھی یہ لفظ ادا کرتے کہ:

((فَنَزَلَتْ)) "پھر یہ نازل ہوئی۔"

اور ان تینوں اصطلاحوں سے ان کی مراد یہ ہوتی کہ فلاں موقع پر حضورؐ نے اس آیت سے یہ حکم نکالا۔ وہ اسے حقیقی معنوں میں لیتے تھے، کیونکہ حضورؐ کا کسی آیت سے کوئی مسئلہ نکالنا بھی وحی پر مبنی ہوتا تھا، اس لیے اس کے لیے بھی " نَزَلَتْ فِيْ كَذَا " (فلاں کے بارے میں نازل ہوئی) کی اصطلاح بالکل درست تھی۔

حاصل کلام یہ کہ صحابہ کرام " نَزَلَتْ فِيْ كَذَا " (فلاں کے بارے میں نازل ہوئی) کی اصطلاح کو اصل شانِ نزول کے علاوہ اور موقعوں کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔

محدّثین کا طریقہ:

اسی طرح محدثین بھی قرآنِ مجید کی آیتوں کے حوالے سے بہت سی ایسی باتیں بیان کر دیتے تھے، جو اصل میں شانِ نزول نہیں ہوتی تھیں۔ مثلاً کبھی صحابہ کرام آپس میں مباحثے کے دوران میں قرآن کی آیات کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے۔ یا کبھی کسی آیت کو بطور مثال بیان کرتے۔ یا کبھی اپنے دعوے کے حق میں حضورؐ کی کسی خاص موقع پر کی ہوئی تلاوت کا حوالہ دیتے۔ یا کبھی ایسی حدیث روایت کرتے جو کسی آیت سے مناسبت رکھتی تھی۔ ان تمام صورتوں میں محدثین ان سب کو آیات کی تفسیر کے ضمن میں ذکر کر دیتے تھے۔

اس کا مقصد کبھی تو شانِ نزول کا بیان ہوتا، کبھی اشارے کے طور پر ان لوگوں کا ذکر کرنا ہوتا جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی تھی، کبھی قرآن کے الفاظ کا صحیح تلفظ بتانا مقصود ہوتا، کبھی قرآن کی سورتوں اور آیتوں کو الگ الگ کرنا ہوتا، اور کبھی یہ مقصد ہوتا کہ قرآنِ مجید کے کسی حکم پر نبی کریم ﷺ نے کس طرح عمل کیا تھا۔

مفسّر کی ذمہ داری:

محدّثین نے کسی آیت کے ضمن میں جو چیزیں بیان کی ہیں وہ شانِ نزول سے متعلق نہیں ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر کرنا ایک مفسر کے لیے ضروری نہیں۔ بلکہ اس کے لیے دو باتوں کا علم ضروری ہے۔

ایک یہ کہ وہ ان واقعات کو تفصیل سے بیان کرے، جن کی طرف آیات میں اشارہ کیا گیا ہو۔ کیونکہ ان واقعات کو سمجھے بغیر ان آیات کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا۔

دوسرے وہ واقعات جن کی وجہ سے کسی عام حکم کو خاص کر دیا گیا ہو، یا جو واقعات بعض آیات کے مفہوم میں تبدیلی کا سبب بنتے ہوں اور انہیں ظاہری مفہوم سے کسی دوسری طرف پھیر دیتے ہوں تو چونکہ ان واقعات کو جانے بغیر بھی آیات کا صحیح مفہوم سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان دونوں قسم کے واقعات کے سوا باقی تمام چیزیں ایک مفسر کے لیے غیر ضروری ہیں۔

انبیائے کرام کے قصے:

اسی ضمن میں انبیائے کرام کے حالات و واقعات بھی آتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر قصے غیر صحیح اور غیر ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ اکثر مفسرین نے جو لمبے چوڑے قصے بیان کیے ہیں، ان کا تعلق احادیث سے نہیں ہے، بلکہ اسرائیلیات یعنی اہل کتاب کے قصے کہانیوں سے ہے جو زیادہ تر غیر مستند اور غیر معتبر ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے ہمیں صحیح بخاری کی ایک حدیث کے ذریعے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ:

((لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ))

”تم اہل کتاب کی باتوں کی نہ تصدیق کرو اور نہ اُن کو جھٹلاؤ۔“

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمیں اہل کتاب کے ان قصے کہانیوں (اسرائیلیات) کی طرف کوئی توجہ نہیں کرنی چاہیے۔

دورِ جاہلیت کے رسم و رواج:

صحابہ کرام اور تابعین نے مشرکین اور یہودیوں کے عقائد اور اُن کے جاہلانہ رسم و رواج کی وضاحت کرتے ہوئے کبھی ان کے بعض معمولی اور مختصر واقعات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر ان کو بیان کرتے وقت انہوں نے ” نَزَلَتْ فِيْ كَذَا “ (فلاں کے بارے میں نازل ہوئی) کی وہی اصطلاح استعمال کی ہے جو وہ شانِ نزول کے لیے استعمال کرتے تھے۔ حالانکہ اس سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ فلاں آیت جب نازل ہوئی تو اس وقت اس طرح کا موقع تھا، یا اسی سے ملتا جلتا موقع تھا۔

صحابہ و تابعین جب یہودیوں اور مشرکین کے عقائد اور ان کے رسم و رواج کے حوالے سے کچھ واقعات بیان کرتے تو اس سے ان کا مقصد قصے کہانیاں بیان کرنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ انہیں اس لیے بیان کردیتے کہ وہ قرآن کی بعض آیتوں میں مذکور حقائق اور اصولوں کا ٹھیک ٹھاک نمونہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر ان کے اقوال میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کا ہر قول ایک نئے مفہوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ان کے مختلف اقوال کا مقصد ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا یہ قول اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

”کوئی شخص اس وقت تک فقیہ نہیں ہوسکتا جب تک اس میں یہ قابلیت نہ ہو کہ وہ ایک ہی آیت کو کئی مختلف موقعوں پر پیش کرسکے۔“

آیات کا ایک خاص اسلوب:

اس سلسلے میں قرآنِ مجید کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ وہ بیک وقت دو مختلف حالتوں کو

بیان کر دیتا ہے۔ ایک حالت کسی خوش قسمت کی ہوتی ہے اور دوسری کسی بدقسمت کی۔ پھر ساتھ ہی ہر ایک کے کچھ اوصاف بھی واضح کر دیتا ہے۔ لیکن ان سے کوئی خاص فرد یا کوئی گروہ مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے اوصاف رکھنے والوں کے بارے میں کچھ احکام بیان کر دیے جائیں۔

1۔ ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ط ﴿15﴾ ﴾ [الاحقاف:15]

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ سے اچھے سلوک کی تاکید کی۔''

مذکورہ آیت کے بعد خوش قسمت اور بدقسمت انسانوں کی دو مختلف قسمیں اور حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ (دیکھیے: الاحقاف آیت: 16 تا 18)

2۔ اسی طرح کی ایک اور آیت یہ ہے:

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ لا قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿24﴾ ﴾

[النحل:24]

''اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے نازل کیا، کہتے ہیں اگلے لوگوں کی کہانیاں۔''

پھر اس کے بعد یہ آیت آئی ہے کہ:

﴿ وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَا اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا ط ﴿30﴾ ﴾

[النحل:30]

''اور جب پرہیز گاروں سے پوچھا جاتا ہے تمہارے رب نے نازل کیا وہ کہتے ہیں بھلائی کی چیز۔''

مذکورہ دونوں آیات بیان کرنے کے بعد شقی یعنی بدقسمت اور سعید یعنی خوش قسمت انسانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح کی چند مزید آیات یہ ہیں اور ان میں بھی کوئی خاص فرد یا گروہ مراد نہیں ہے:

3۔ ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا

رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ ..... ﴿112﴾ [النحل:112]

''اور اللہ نے ایک بستی والوں کی مثال بیان کی جو امن و اطمینان میں تھے۔ انہیں ہر طرف سے وافر رزق پہنچ رہا تھا۔ پھر انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی......''

4۔ ﴿ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ج ..... ﴿189﴾ ﴾ [الاعراف:189]

''وہی اللہ ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ ایک دوسرے سے سکون حاصل کریں۔......''

5۔ ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿1﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿2﴾ ﴾ [المومنون:1،2]

''وہ ایمان والے یقیناً فلاح پائیں گے جو اپنی نماز خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں۔''

6۔ ﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿10﴾ ﴾ [القلم:10]

''اور بہت سی قسمیں کھانے والے بے وقعت آدمی کا کہنا نہ مانیں۔......''

7۔ ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط ﴿261﴾ ﴾

[البقرہ:261]

''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کے ثواب کی مثال بیج کے اس دانے کی ہے جس سے سات بالیں پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔''

اس آیت میں مثال کے لیے ایک ایسے دانے کا ذکر ہے، جس سے سات بالیاں پیدا ہوتی ہوں اور ہر بالی میں سو (100) دانے ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس طرح کا

کوئی خاص دانہ موجود ہو۔ بلکہ اس مقام پر محض اجر وثواب میں اضافے اور زیادتی کا تصور دلانا مقصود ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔

چونکہ قرآن مجید میں اس طرح کے مقامات پر کوئی خاص چیز یا فرد مراد نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے مخصوص نہیں کرنا چاہیے۔

قرآن کا ایک اور اسلوب:

قرآنِ مجید میں ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ جب وہ کوئی حکم بیان کرتا ہے تو کبھی ایسا مقام آ جاتا ہے، جہاں ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے تو وہیں موقع پر اس سوال کا جواب دے دیا گیا ہے۔

اس طرح کے اندازِ بیان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پہلی بات کی وضاحت کردی جائے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اس وقت کسی نے واقعی کوئی سوال کیا تھا۔ لیکن صحابہ کرام کی یہ عادت تھی کہ جب وہ اس قسم کی آیات پر غور وفکر کرتے تو پہلے کوئی سوال فرض کر لیتے اور پھر آیت کا مطلب سوال وجواب کی شکل میں بیان کردیتے تھے۔

چنانچہ اگر قرآنِ حکیم کے ان مقامات کو غور وتدبر سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ دراصل ایک ہی سلسلۂ کلام ہے اور اس میں اس بات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ نزولی ترتیب کے لحاظ سے آیات کو مقدم یا موخر کردیا جائے، بلکہ سارا کلام ایک خاص نظم اور ترتیب سے ہوتا ہے، جس میں کوئی تغیر اور ردّ وبدل کرنا درست نہیں۔

آیات کی تقدیم وتاخیر:

صحابہ کرام کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ آیتوں کا مطلب بیان کرتے ہوئے اکثر ان کی ترتیب بدل دیتے تھے اور پہلے اور بعد میں نازل ہونے والی آیات میں تقدیم وتاخیر کردیتے تھے۔ لیکن اس سے ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان آیات کی اصل نزولی ترتیب پر یقین نہیں رکھتے۔

بلکہ بعض اوقات وہ اس طرح کی نئی ترتیب محض مرتبے اور مقام کے لحاظ سے قائم کرتے تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے درج ذیل آیت کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿34﴾ ﴾ [التوبہ:34]

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں ایک دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیجیے۔''

ان کے نزدیک اس وقت تک سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی منع تھی، لیکن جب زکوٰۃ کی آیت نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے ذریعے مال کا پاک ہونا بیان فرمادیا۔ لہٰذا زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی جائز ہوگئی۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ سورۂ التوبہ آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے اور مذکورہ آیت اس سے کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جس تقدیم وتاخیر کا دعویٰ کیا ہے اس میں انہوں نے درحقیقت ایک اجمال واختصار کو مقدم اور اس کی تفصیل کو مؤخر کر کے بیان کر دیا ہے۔

مفسر کا کام:

لیکن ایک مفسر کا کام یہ ہے کہ وہ اس طرح کے مختلف حالات و واقعات میں دو باتوں کا خاص خیال رکھے:

1۔ ایسے غزوات اور واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ موجود ہے اور جن پر ان آیات کو سمجھنے کا دارومدار ہے ان کا ذکر تفصیلی طور پر کرے۔

2۔ اگر آیات میں کوئی شرط یا استثناء (Exception) وغیرہ ہو، کسی خاص نکتے پر زور دیا گیا ہو اور ان سب کو سمجھنے کے لیے آیات کا شانِ نزول جاننا ضروری ہو تو ایسی

آیات کی تفسیر میں ان کا شانِ نزول بیان کردیا جائے۔

اگر چہ اس دوسری بات کا تفسیر سے براہِ راست تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ایک قسم کی توجیہ اور وضاحت ہے جو کہ ایک مستقل علم ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کلام میں کوئی ایسی وجہ بیان کردی جائے جس سے اس میں پیدا ہونے والے تمام شکوک وشبہات دور ہو جائیں۔

چونکہ تفسیر میں اس علم کی اکثر ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا ایک مفسر کو اس کا بھی علم ہونا چاہیے۔

مثال کے طور پر یہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿ یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ ..... (28) ﴾ [مریم:28]

''اے ہارون کی بہن!......''

لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد انہی الفاظ سے خطاب کیا تھا۔

اس آیت کے بارے میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزاروں برس کی مدت حائل ہے پھر حضرت ہارون علیہ السلام حضرت مریم علیہ السلام کے بھائی کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کا پس منظر یہ ہے کہ سوال کرنے والا اس ہارون کو بھی وہی ہارون علیہ السلام سمجھتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے۔ خود نبی کریم ﷺ نے اس سوال کا یہ جواب دیا تھا کہ اس سے وہ ہارون مراد نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے، بلکہ اس نام کا ایک اور شخص حضرت مریمؑ کے زمانے میں بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں بزرگوں کے نام پر نام رکھنے کا عام رواج تھا۔

اسی طرح سورۂ الفرقان کی آیت نمبر 34 کے حوالے سے نبی ﷺ سے یہ سوال کیا گیا کہ لوگ قیامت کے دن منہ کے بل کس طرح چلیں گے؟

تو حضورؐ نے فرمایا:

"جس ذات نے انسان کو دنیا میں پاؤں سے چلنا سکھایا وہ یہ قدرت بھی رکھتی ہے کہ اسے منہ کے بل چلا دے۔"

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ان دو آیتوں میں بظاہر تضاد کے بارے میں سوال کیا گیا:

آیت نمبر:1

﴿ وَلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿101﴾ ﴾ [المومنون:101]

"وہ آپس میں سوال نہیں کریں گے۔"

آیت نمبر:2

﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿27﴾ ﴾

[الصافات:27]

"وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں سوال کریں گے۔"

تو ان دونوں آیتوں میں مطابقت کیسے ہو گی؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"پہلی آیت کا تعلق محشر کے دن سے ہے۔ دوسری آیت کا جنت سے۔"

گویا محشر میں لوگوں کو ایک دوسرے سے سوال کرنے کا ہوش نہ ہو گا۔ لیکن جب وہ جنت میں ہوں گے تو ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور باہم سوال و جواب کریں گے۔

ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ اگر صفا اور مروہ کے درمیان سعی ضروری ہے تو قرآن میں اس کے لیے لَا جُنَاحَ (کوئی گناہ نہیں) کے الفاظ کیوں آئے ہیں؟

پوری آیت یوں ہے:

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ج فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ

اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ ﴿158﴾ [البقرہ:158]

’’بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔اس لیے جو کوئی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں کے چکر لگا لے۔اور جو خوشی سے نیکی کرے گا تو اللہ قدر دان اور جاننے والا ہے۔‘‘

اس پر ام المومنینؓ نے جواب دیا:

’’کچھ لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے سے گریز کرتے تھے، کیونکہ وہاں دو بت رکھے ہوئے تھے۔اس لیے ان سے کہا گیا کہ اگر یہ سعی کر لو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔‘‘

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ قصر نماز کے حکم کے ساتھ اِنْ خِفْتُمْ (اگر تمہیں اندیشہ ہو) کی شرط کیوں ہے؟ تو اس پر آپؐ نے فرمایا:

((صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَیْكُمْ ، فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ))

[صحیح مسلم ، مشکوٰۃ ح:1335]

’’امن میں قصر نماز کی اجازت اللہ تعالیٰ کا تم پر صدقہ ہے تم اسے قبول کرو۔‘‘

سخی لوگ صدقہ دینے میں کوئی زحمت محسوس نہیں کرتے ، بلکہ دل کھول کر صدقہ کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط ضروری نہیں، بلکہ ویسے ہی ہے۔

اس طرح کی توجیہ وتشریح کے حوالے سے اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن ہمارا مقصد صرف اس اسلوب کی جانب توجہ دلانا ہے، تاکہ تفسیر کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے۔

4۔ مزید مباحث

قرآن فہمی کے لیے مزید چند امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

1۔ حذف (Implied):

حذف کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں کوئی ایسا لفظ یا فقرہ چھوڑ دیا جائے جس سے اس میں خلاء اور اِبہام (Ambiguity) پیدا ہو جائے۔

2۔ اِبدال (Substitute - Alternative):

ابدال سے مراد ہے کلام میں ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے بدل دینا۔

3۔ تقدیم و تاخیر:

اس کا مطلب ہے کلام میں کسی لفظ یا عبارت کو عام ترتیب سے ہٹا کر مقدم یا موخر کر دینا۔ وہ اس طرح کہ جو چیز پہلے بیان کرنی تھی، وہ بعد میں بیان کی جائے اور جسے بعد میں آنا تھا، اسے پہلے لایا جائے۔

4۔ متشابہات یا اشارہ کنایہ:

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی غیر مادی یا غیر محسوس چیز کو کسی ایسی مادی اور محسوس چیز کے ذریعے بیان کرنا، جس سے اسے کوئی مناسبت ہو اور اس طرح حقیقتِ حال کی سچی اور مجسم تصویر ہمارے سامنے آ جائے۔ اصطلاح میں اسے استعارہ کنایہ یا مجاز عقلی کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا تمام اُمور ایسے ہیں، جن کی وجہ سے کبھی کبھی آیات کا اصل مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آتی آ جاتی ہے۔

ذیل میں ہم ان سب کی اُلگ اُلگ مثالیں تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں، تا کہ ان

کی وضاحت ہوجائے اوراس سے قرآن فہمی کی راہ آسان ہوجائے۔

1۔حذف (Implied):

حذف کی بعض صورتیں یہ ہیں:

(1) مضاف کا حذف ہونا

(2) موصوف کا حذف ہونا

(3) متعلقات کا حذف ہونا

(4) اسی طرح کی بعض دوسری چیزوں کا حذف ہونا

اب ان سب کی مثالیں دیکھتے ہیں:

(1) ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ............ ﴾ [البقرہ: 177]

''اور لیکن نیکی یہ ہے جو ایمان لائے۔''

اصل میں فقرہ یوں تھا کہ:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ ﴾

''اور لیکن نیکی اُس کی نیکی ہے جو ایمان لائے......''

(2) ﴿ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ﴾

[بنی اسرائیل: 59]

''اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی بصیرت کے لیے مگر انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا۔''

اس آیت میں مُبْصِرَةً کے لفظ سے پہلے اٰیَة (نشانی) کا لفظ محذوف ہے۔ لفظ مُبْصِرَةً کا تعلق اسی اٰیَة (نشانی) سے ہے، نَاقَةٌ (اونٹنی) سے نہیں ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ اونٹنی آنکھوں والی تھی۔ مراد یہ ہے کہ وہ اونٹنی آنکھیں کھول دینے والی ایک نشانی تھی۔

(3) ﴿ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ﴾ [البقرہ: 93]

''اور اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کے دلوں میں بچھڑے کی (محبت) پلائی گئی۔''

اس آیت میں اَلْعِجْلَ (بچھڑے) سے پہلے حُبُّ (محبت) کا لفظ محذوف ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت رچ بس گئی تھی۔

(4) ﴿ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ﴾ [الکھف:74]

''اُس نے کہا کیا تو نے ایک معصوم جان کو ناحق قتل کر ڈالا۔''

اس آیت میں '' نَفْسٌ '' (جان) سے پہلے '' قَتْل '' کا لفظ محذوف ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس نے نہ کسی کو قتل کیا، پھر کیوں تم نے اس بے گناہ اور معصوم بچے کی جان لے لی۔

(5) ﴿ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الروم:26]

''اور اُسی کا ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین (میں) ہے۔''

یہاں وَالْاَرْضَ (اور زمین) سے پہلے وَمَنْ فِي (اور جو اُس میں) کا لفظ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ''جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے۔'' لیکن دوسرا ''کوئی'' حذف کر دیا گیا ہے۔

(6) ﴿ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ﴾

[بنی اسرائیل:75]

''پھر ہم ضرور تجھے زندگی اور موت کا دوہرا عذاب چکھاتے۔''

اس آیت میں حیات (زندگی) اور ممات (موت) کے الفاظ آئے ہیں، لیکن ان دونوں لفظوں سے پہلے ''عَذَابُ '' کا لفظ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے عذاب میں اضافہ اور موت کے عذاب میں اضافہ۔

(7) ﴿ وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ ﴾ [یوسف:82]

''اور تو بستی (والوں) سے پوچھ لے۔''

لیکن بستی ایسی چیز نہیں جس سے سوال کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہاں قَرْيَةٌ سے پہلے اَهْلَ (باشندے) کا فلظ محذوف ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ''بستی والوں سے پوچھ لیجئے۔''

(8) ﴿ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا ﴾ [ابراهيم:28]

''اُنہوں نے اللہ کی نعمت کا (شکر کرنے کی بجائے) ناشکری کی۔''

اصل جملہ یہ تھا کہ: فَعَلُوْا مَکَانَ شُکْرِ نِعْمَۃِ اللّٰهِ كُفْرًا (ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے کی بجائے ناشکری کی۔)

یہ بھی حذف کی مثال ہے۔

(9) ﴿ اِنَّ هٰذَ الْقُرْآن يَهْدِى لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ ﴾ [بنی اسرائیل:9]

''بے شک یہ قرآن سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

یہاں پر اَلَّتِیْ سے پہلے لفظ خَصْلَۃٌ (خصلت) محذوف ہے۔یعنی اُس خصلت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔

(10) ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ﴾ [المؤمنون:96]

''برائی کے جواب میں اچھائی اختیار کریں۔''

یہاں بھی اَلَّتِیْ سے پہلے خَصْلَۃٌ (خصلت طریقہ) کا لفظ حذف ہے۔

(11) ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿101﴾ ﴾ [الانبیاء:101]

''بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ دوزخ سے دُور رکھے جائیں گے۔''

اس جگہ لفظ اَلْحُسْنٰی (بھلائی) سے پہلے اَلْکَلِمَۃُ (بات) یا اَلْعِدَّۃُ (مدت) کا لفظ حذف ہے۔

(12) ﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ج ﴾

[البقرہ:102]

''اور وہ اسی چیز کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کی سلطنت کے زمانے میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔''

اس آیت میں مُلْكِ سے پہلے عَهْدُ (زمانہ) کا لفظ محذوف ہے۔ یعنی سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی کے زمانے میں۔

(13) ﴿ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ ﴾

[آل عمران:194]

''اے ہمارے رب! ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے۔''

یہاں پر رُسُلِكَ (اپنے رسولوں) سے پہلے اَلْسِنَةِ (زبانوں) کا لفظ حذف ہے۔ مراد یہ ہے کہ رسولوں کی زبانوں کے ذریعے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں عطا فرما۔

(14) ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ① ﴾ [القدر:1]

''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔''

اس آیت میں (هٗ) کی ضمیر لفظ '' اَلْقُرْآنَ '' کی جگہ آ گئی ہے جو کہ اس ضمیر کا مرجع ہے مگر مذکور نہیں ہوا۔

(15) ﴿ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴾ [ص:32]

''یہاں تک کہ سورج پردے میں چھپ گیا۔''

یہاں پر بِالْحِجَابِ سے پہلے اَلشَّمْسُ (سورج) کا لفظ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سورج پردے میں چھپ گیا۔ (اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ وہ گھوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس صورت میں یہاں کوئی محذوف ماننے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مترجم)

(16) ﴿ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ⑧⓪ ﴾ [القصص:80]

''اور یہ چیز نہیں ملتی، مگر صبر کرنے والوں کو۔''

اس جگہ ھَا کی ضمیر اصل میں خَصْلَةُ الصَّبْرِ (صبر کی صفت) کی جگہ استعمال ہوئی ہے۔

(17) ﴿ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ط ﴾ [المائدہ:60]

''اور انہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔''

اس آیت میں عَبَدَ کے لفظ سے پہلے جَعَلَ مِنْهُمْ کا فقرہ محذوف ہے۔ اصل فقرہ یوں تھا: ﴿ وَجَعَلَ مِنْهُمْ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ﴾ ''کہ ان میں سے بعض کو ایسا بنایا کہ انہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔''

(18) ﴿ فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ﴿54﴾ ﴾ [الفرقان:54]

''پھر اُس کا میکہ اور سسرال بنایا۔''

اس جگہ فَجَعَلَهٗ (پھر اُسے بنایا) اصل میں فَجَعَلَ لَهٗ (پھر اس کے لیے بنایا) تھا۔ اصل فقرہ یوں تھا کہ: ﴿ فَجَعَلَ لَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ط ﴾ ''پھر اُس کے لیے میکہ اور سسرال بنایا۔''

(19) ﴿ وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا ﴿155﴾ ﴾

[الاعراف:155]

''اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر (70) آدمی چن لیے۔''

اس جگہ قَوْمَهٗ سے پہلے مِنْ (سے) کا لفظ حذف ہے۔

(20) ﴿ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ط ﴾ [هود:60]

''آگاہ رہو بے شک قوم عاد نے اپنے رب کی ناشکری کی۔''

اس مقام پر لفظ رَبَّهُمْ (اپنے رب کی) سے پہلے نِعْمَةَ (نعمت) کا لفظ حذف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قومِ عاد نے اپنے رب کی نعمت کی ناشکری کی۔

(21) ﴿ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُ تَذْكُرُ يُوْسُفَ ط ﴾ [یوسف:85]

''وہ بولے اللہ کی قسم! آپ ہمیشہ یوسف کو یاد کرتے رہیں گے۔''

یہاں پر اصل میں لَا تَفْتَؤُ (ہمیشہ) تھا۔

(22) ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی ط ﴾ [الزمر:3]

''ہم تو اُن کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل

کریں۔"

اس جگہ پر شروع میں یَقُوْلُوْنَ (وہ کہتے ہیں) کا لفظ حذف ہے۔

(23) ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ ﴾ [الاعراف:152]

"بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا۔"

یہاں پر اَلْعِجْلَ (بچھڑے کو) کے لفظ سے پہلے اِلٰھًا (معبود) کا لفظ حذف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

(24) ﴿ قَالُوْا اِنَّکُمْ کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ ﴿28﴾ ﴾

[الصافات:28]

"وہ کہیں گے بے شک تم ہمارے پاس دائیں طرف سے آتے تھے۔"

اس مقام پر بعد میں وَعَنِ الشِّمَالِ (اور بائیں طرف سے) محذوف ہے۔ مراد یہ ہے کہ تم دائیں اور بائیں ہر طرف سے ہمارے پاس آتے تھے۔

(25) ﴿ فَظَلْتُمْ تَفَکَّھُوْنَ ﴿65﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿66﴾ ﴾

[الواقعہ:66,65]

"پھر تم باتیں بنانے لگو۔ بے شک ہم پر چٹی پڑ گئی۔"

اس جگہ پر اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ (بے شک ہم چٹی پڑ گئی) سے پہلے یَقُوْلُوْنَ (وہ کہیں گے) کا لفظ محذوف ہے۔

(26) ﴿ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَّلٰٓئِکَۃً ﴾ [الزخرف:60]

"اگر ہم چاہتے تو (تمہاری جگہ) فرشتے پیدا کردیتے۔"

اس جگہ مِنْکُمْ (تم میں سے) سے پہلے بَدَلًا (متبادل۔ بدل) کا لفظ محذوف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو پیدا کیا جاتا۔

(27) ﴿ کَمَآ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ ﴾ [الانفال:5]

"جیسا کہ تیرے رب نے تجھے نکالا۔"

اس جگہ اَخْرَجَ کا لفظ اصل میں اَمْضِ (چلایا) کے لفظ کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

حذف کی مثالیں:

مذکورہ مثالوں کے علاوہ قرآنِ مجید میں بعض اور قسم کے محذوفات بھی ملتے ہیں، جن کی طرف سیاقِ کلام (Context) میں کوئی نہ کوئی اشارہ موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:

1۔ کبھی حرف اَنَّ (کہ۔ یہ کہ) کی خبر حذف کردی گئی ہے۔

2۔ کبھی شرطیہ جملے میں شرط کی جزا کو حذف کردیا ہے۔

3۔ کبھی کسی فعل کے مفعول کو حذف کیا گیا ہے۔

4۔ کہیں جملے کا مبتدا محذوف ہے۔

اب ان کی چند مثالیں دیکھیے:

(1) ﴿ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿149﴾ ﴾ [الانعام:149]

"پھر اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔"

یہاں پر لفظ شَآءَ کے بعد هِدَايَةً (ہدایت) کا لفظ محذوف ہے۔

(2) ﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ط ﴾ [یونس:108]

"(یہ) حق تمہارے رب کی طرف سے ہے۔"

یہاں پر شروع میں لفظ هٰذَا (یہ) محذوف ہے۔ فقرہ یوں تھا:

﴿ هٰذَا الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ط ﴾

"یہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔"

(3) ﴿ لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ط ﴾

[الحدید:10]

"تم میں سے جنہوں نے فتح سے پہلے مال خرچ کیا اور جہاد کیا وہ دوسروں کے برابر نہیں ہیں۔"

اس آیت میں ﴿ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ ﴾ کے بعد ﴿ وَمَنْ اَنْفَقَ بَعْدَ الْفَتْحِ ﴾ بھی ہونا چاہیے تھا۔لیکن یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔

لیکن پورا جملہ اس لیے حذف کر دیا گیا کہ آخر میں ایسی عبارت موجود ہے، جو اس حذف کی وضاحت کر دیتی ہے۔

(4) ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿45﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿46﴾ ﴾ [يٰسٓ:46,45]

"اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اس عذاب سے جو تمہارے آگے اور پیچھے ہے، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور اُن کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی اُن کے پاس نہیں آتی، جس سے وہ منہ نہ پھیر لیتے ہوں۔"

اس جگہ وَمَا خَلْفَكُمْ (جو تمہارے پیچھے ہے۔) کے بعد اَعْرَضُوْا (وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔) کا لفظ محذوف ہے۔

حذف سے ملتا جلتا ایک اور قرآنی اُسلوب:

قرآنِ مجید میں حذف سے ملتا جلتا ایک اور اسلوب بھی ہے، جس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ وہ اسلوب یہ ہے کہ جو آیات "اِذْ" کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں۔ جیسے:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ ط ﴾ [البقرة:30]

یا جیسے:

﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ ط ﴾ [البقرة:67]

اس طرح کی آیتوں میں "اِذْ" کا لفظ ایک ایسا ظرف ہے، جو فعل کے معنی دیتا ہے۔ لیکن اسے اس کے اصلی معنوں سے ہٹا کر ڈرانے اور ہولناکی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس وقت "اِذْ" کا لفظ یہ فائدہ دیتا ہے کہ بغیر کسی ڈرانے والے کا ذکر کیے، اچانک

ہولناک یا ڈراؤنا واقعہ بیان کر دیا جاتا ہے، جس سے ذہن متاثر ہوتا ہے اور دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سارا ڈراؤنا مضمون محض "اِذْ" کے استعمال سے ظاہر کر دیا جاتا ہے۔

حذف کا ایک اور انداز:

اہلِ عرب میں حذف کا ایک عام انداز یہ بھی ہے کہ وہ اَنْ (مصدریہ) سے پہلے حرف جار کو حذف کر دیتے ہیں اور اسے لِاَنَّ (تاکہ) کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں بھی حذف کا یہ انداز کئی مقامات پر موجود ہے۔

شرط کے جواب کا محذوف ہونا:

قرآنِ مجید میں کبھی شرطیہ جملے کا جواب محذوف (implied) ہوتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل مثالوں سے واضح ہے:

(1) ﴿ وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ ط ﴾

[الانعام:93]

"اور کاش تم اس وقت دیکھ پاتے جب کہ یہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے۔"

(2) ﴿ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ط ﴾

[البقرۃ:165]

"اور کاش کہ یہ ظالم دیکھ پاتے، جبکہ وہ عذاب کو دیکھیں گے۔"

اس طرح کی آیات میں جوابِ شرط محذوف ہوتا ہے، لیکن اس قسم کے جملوں میں لفظ کو اُس کے اصل معنی کی بجائے تعجب یا ڈرانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ایسے مقامات پر حذف شدہ لفظ یا جملہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ محض تعجب کا مفہوم ہی کافی ہوتا ہے۔

ابدال کا قرآنی اسلوب:

قرآن میں ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ کسی لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے تبدیل کر کے لایا

جاتا ہے۔اس کی کئی صورتیں اور شکلیں ہیں۔ مثال کے طور پر:

1۔ کبھی فعل کو فعل سے بدل دیا جاتا ہے۔

2۔ کبھی کسی اسم کو دوسرے اسم سے بدل دیا جاتا ہے۔

3۔ کبھی ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدل دیا جاتا ہے۔

4۔ کبھی پورا جملہ کسی اور جملے سے بدل دیا جاتا ہے۔

5۔ کبھی معرفہ کو نکرہ سے اور کبھی نکرہ کو معرفہ سے بدل دیا گیا ہے۔

6۔ کبھی مذکر کو مونث سے اور کبھی مونث کو مذکر بیان کیا گیا ہے۔

7۔ کبھی واحد کو جمع اور کبھی جمع کو واحد استعمال کیا گیا ہے۔

ان سب کی تفصیل یہ ہے:

(1) فعل کی فعل سے تبدیلی:

قرآن میں کسی فعل کو دوسرے فعل سے بدل دینے کا اسلوب بہت عام ہے اور اس اسلوب کے استعمال کی بہت سی حکمتیں ہیں، جن کو بیان کرنا اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔

بہرحال قرآن میں فعل کی فعل سے تبدیلی کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ اَھٰذَا الَّذِیۡ یَذۡکُرُ اٰلِھَتَکُمۡ ﴾ [الانبیاء:36]

''کیا یہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں پر تنقید کرتا ہے۔''

اس آیت میں یَذۡکُرُ (یاد کرتا) کی جگہ یَسُبُّ (برا بھلا کہتا) کا لفظ تھا۔ یہاں پر یَسُبُّ کی جگہ یَذۡکُرُ آ گیا۔

یہی اندازِ بیان خود ہماری زبان کے روزمرے اور محاورے میں بھی پایا جاتا ہے۔اور جیسے عرف اور رواج بھی کہا جا سکتا ہے۔ جیسے کسی کی طبیعت خراب ہو تو کہہ دیتے ہیں دشمنوں کی طبیعت خراب ہے۔ کبھی یوں کہتے ہیں کہ بندگانِ حضرت تشریف لا چکے ہیں اور مراد ہوتی ہے کہ آپ تشریف لا چکے ہیں۔ کبھی ہم یوں کہہ دیتے ہیں کہ: ''بندگانِ جناب عالی اس

بات سے واقف ہیں۔'' اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اس بات سے واقف ہیں۔

اسی قسم کا اسلوب قرآنِ مجید میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔

(2) ﴿ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿43﴾ ﴾ [الانبیاء:43]

اس مقام پر يُصْحَبُوْنَ (وہ ساتھ دیں گے۔) کا لفظ دراصل يُنْصَرُوْنَ (وہ مدد کریں گے۔) کی جگہ آیا ہے۔ چونکہ نصرت اور مدد کا تصور ملنے جلنے، اکھٹے ہونا، ملاقات کرنے اور ساتھی بننے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لیے نصرت کی جگہ صحبت کا مفہوم لایا گیا۔

(3) ﴿ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ﴾ [الاعراف:187]

''وہ آسمانوں اور زمین پر بڑی بھاری ہے۔''

اس جگہ ثَقُلَتْ (بھاری ہے) کا لفظ خَفِيَتْ (پوشیدہ ہے) کے معنوں میں ہے۔ کیونکہ ایسی چیز جو آسمان والوں اور زمین والوں دونوں سے پوشیدہ ہو، وہ سب کے لیے اہم اور بھاری ہوتی ہے۔

(4) ﴿ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا ط ﴾ [النساء:4]

''پھر اگر وہ اپنی خوشی سے اس مین سے کچھ تمہارے لیے چھوڑ دیں تو......''

یہ اصل میں فقرہ یوں تھا: ﴿ فَاِنْ عَفَوْنَ لَكُمْ مِنْ شَيْءٍ مِنْ طِيْبَةٍ مِنْ نُفُوْسِهِنَّ ﴾

مطلب یہ ہے کہ ''اگر وہ اپنے جی کی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو......''

اسم کی اسم سے تبدیلی کا اسلوب:

قرآنِ مجید میں کہیں کہیں اسم کو اسم سے بدل دینے کا اُسلوب بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿4﴾ ﴾ [الشعراء:4]

''پھر ان کی گردنیں اُن کے آگے جھک جائیں۔''

اس آیت میں اسم خَاضِعَةً (جھکی ہوئی) کی جگہ خٰضِعِیْنَ (جھکے ہوئے) کا اسم آ گیا ہے۔

(2) ﴿ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿12﴾ ﴾ [التحریم:12]

''اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی۔''

اس مقام پر فاعل مونث ہے اس لیے اس کی مطابق سے اَلْقَانِتَاتِ (فرماں برداری کرنے والیاں) آنا تھا، لیکن اس کی جگہ اَلْقٰنِتِيْنَ (فرماں برداری کرنے والے) آ گیا ہے۔

(3) ﴿ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿22﴾ ﴾ [آل عمران:22]

''اور اُن کا کوئی مددگار نہیں۔''

اس مقام پر جملے کی ساخت و بناوٹ کے لحاظ سے واحد اسم نَاصِرٍ (مدد کرنے والا) آنا چاہیے تھا، لیکن اس کی جگہ ناصرین (مدد کرنے والے) کا اسم آ گیا جو کہ جمع کے لیے ہے۔

(4) ﴿ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ﴿48﴾ [سورۃ الحاقہ :47]

''پھر تم میں سے کوئی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

یہاں پر بھی حَاجِزٍ (روکنے والا) واحد اسم کی جگہ کا اسم حٰجِزِيْنَ (روکنے والے) آ گیا ہے۔

(5) ﴿ وَالْعَصْرِ ﴿1﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿2﴾ ﴾

[العصر:1،2]

''زمانے کی قسم، بے شک انسان ضرور خسارے میں ہے۔''

اس جگہ اَلْاِنْسَانَ کا لفظ دراصل بَنِیْ اٰدَمَ یعنی پوری انسانیت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اسم جنس ہے اور اس کے مفہوم میں تمام بنی آدم شامل ہیں، اس لیے یہ واحد آ گیا ہے۔

(6) ﴿ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ﴿6﴾ ﴾

[الانشقاق :6]

”اے انسان! تو تکلیفیں اُٹھا کر اپنے رب کی طرف جا رہا ہے پھر اُس سے ملنے والا ہے۔“

اس آیت میں بھی انسان کا لفظ بنی آدم یعنی پوری انسانیت کے لیے واحد آ گیا ہے۔

(7) ﴿ وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ﴾ [الاحزاب : 72]

”اور اُسے انسان سے اُٹھالیا۔“

یہاں بھی الانسان کا لفظ بنی آدم کے لیے ہے اور اس کی وجہ پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

(8) ﴿ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ ﹰالْمُرْسَلِينَ ﴿105﴾ ﴾ [الشعراء:105]

”نوحؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔“

یہاں پر اَلْمُرْسَلِیْنَ (بھیجے گئے، رسول) کا لفظ اصل میں نُوحًا (نوح) کی جگہ آ گیا ہے کیونکہ اَلْمُرْسَلِیْنَ اگر چہ عام اور جمع کے لیے ہے لیکن اس سے مراد صرف حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔

(یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ ایک رسول کا انکار سب رسولوں کا انکار ہے لہٰذا اس جگہ واحد کی بجائے جمع کا صیغہ آ گیا ہو۔ مترجم)

(9) ﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿1﴾ ﴾ [الفتح:1]

”بے شک ہم نے آپؐ کو کھلی فتح دی ہے۔“

یہاں پر اِنَّا (بے شک ہم) دراصل اِنِّیْ (بے شک میں) کی جگہ آیا ہے۔

(یہ بھی ہو سکتا یہ کہ شاہانہ اندازِ کلام کی وجہ سے واحد کی جگہ جمع کی ضمیر آئی ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتؐ زیادہ ظاہر ہو۔ مترجم)

(10) ﴿ إِنَّا لَقَدِرُوْنَ ﴿40﴾ ﴾ [المعارج:40]

”بے شک ہم ضرور قادر ہیں۔“

یہ بھی اِنِّیْ قَادِرٌ کی جگہ آیا ہے اس کا سبب وہی ہے جو اُوپر بیان ہوا۔

(11) ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ ﴾ [الحشر: 6]

''اور لیکن اللہ اپنے رسولوں کو مسلط کرتا ہے۔''

یہاں پر رُسُلَهٗ (اپنے رسولوں) کا لفظ جمع آ گیا ہے حالاں کہ یہاں پر صرف ایک فرد حضرت محمد ﷺ مراد ہیں کیونکہ آپؐ دوسرے تمام رسولوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

(12) ﴿ الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ﴾ [آل عمران: 173]

''یہ وہ ہیں جن کو لوگوں نے کہا۔''

اس جگہ النَّاسُ (لوگوں نے) کا لفظ جمع آ گیا ہے لیکن مراد ایک شخص عروہ ثقفی ہے۔

(13) ﴿ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ ﴾ [النحل:112]

''پھر اللہ نے اُنہیں بھوک کا لباس چکھایا۔''

اس مقام پر لِبَاسَ (لباس) کا لفظ طَعْمٌ (مزہ، ذائقہ) کی جگہ استعمال ہوا ہے، اس کی وجہ دونوں الفاظ میں ایک خاص مناسبت اور مشابہت ہے اور وہ یہ ہے کہ بھوک بھی جسم کو کمزور اور لاغر بنا کر لباس کی طرح پورے جسم پر مسلط ہو جاتی ہے۔

(14) ﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ ج ﴾ [البقرہ:138]

''اللہ کا رنگ۔''

اس جگہ صِبْغَةَ اللّٰه (اللہ کا رنگ) کے الفاظ دراصل دِيْنَ اللّٰهِ (اللہ کا دین) کی جگہ آئے ہیں۔ دین کو صِبْغَةَ (رنگ) قرار دینا ایک تو اس لحاظ سے ہے کہ جس طرح کپڑے پر رنگ چڑھتا ہے اسی طرح انسان کی شخصیت پر دین کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ دوسرے یہ اس اعتبار سے بھی ہے کہ بعض مصلحتوں کی بنا پر یہاں عیسائیوں کی ایک خاص مذہبی رسم اِصطباغ (Baptism) سے مشابہت دینا مقصود ہے۔

(15) ﴿ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ﴿2﴾ ﴾ [التین:2]

''قسم ہے طور سینین کی۔''

اس جگہ سِيْنِيْنَ کا لفظ درحقیقت سَيْنَاءَ (سینا) کی جگہ آ گیا ہے جو اصل نام ہے۔

(16) ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى اِلْيَاسِيْنَ ﴾ [الصافات:130]

''سلام ہو الیاسینؑ پر۔''

یہاں بھی اِلیَاسِیْن کا لفظ اصل میں اِلْیَاسَ کی جگہ آیا ہے۔

نوٹ:...... آیت نمبر 15، 16 میں الفاظ کی تبدیلی کا سبب وہ یکسانی اور برابری ہے جو آپس میں ان الفاظ کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اہل عرب بعض اسموں کے آگے یْنَ یونہی بڑھا دیا کرتے تھے۔

حرف کی حرف سے تبدیلی کا اُسلوب:

قرآن کی بعض آیات میں ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف استعمال ہوا ہے اس کے چند حوالے یہ ہیں:

(1) ﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ ﴾ [الاعراف:143]

''پھر جب اُس کے رب نے پہاڑ پر تجلی ڈالی۔''

اس آیت میں لفظ جَبَل (پہاڑ) کے ساتھ حرف جار (لِ) آیا یہ جو عَلٰی (پر، اُوپر) کی جگہ آ گیا ہے۔

(2) ﴿ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ ۝61 ﴾ [المؤمنون:61]

''اور وہ اس کی طرف سب سے آگے نکلنے والے ہیں۔''

اس آیت میں لَهَا (اُس کے لیے) دراصل اِلَیْهَا (اس کی طرف) کی جگہ آ گیا ہے۔

(3) ﴿ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝10 ﴾ [النمل:10]

''بے شک میرے حضور میں رسول ڈرا نہیں کرتے۔''

اس مقام پر اِلَّا (مگر، یقین) کا حرف دراصل لٰکِنْ (لیکن، البتہ) کے معنوں میں ہیں اور یہاں سے نیا فقرہ شروع ہو گیا ہے۔

(4) ﴿ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ [طٰهٰ:71]

''اور میں ضرور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔''

اس آیت میں فِیْ (میں) کا حرف عَلیٰ (پر) کی جگہ آ گیا ہے۔

(5) ﴿ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ﴾ [الطور:38]

''یا اُن کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر وہ سنتے ہیں۔''

اس جگہ عَلَیْهِ (اُس پر) کی بجائے فِیْهِ (اُس میں) کا حرف آ گیا ہے۔

(6) ﴿ اَلسَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ ﴾ [المزمل:18]

''اُس میں آسمان پھٹ جائے گا۔''

یہاں پر فِیْهِ (اس میں) کی جگہ بِهٖ (اُس کے ساتھ) کا حرف آ گیا ہے۔

(7) ﴿ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ ﴾ [المؤمنون:67]

''اُس سے تکبر کرتے ہوئے۔''

اس جگہ عَنْهُ (اُس سے) کی جگہ بِهٖ (اُس کے ساتھ) کا حرف آ گیا ہے۔

(8) ﴿ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ ﴾ [البقرہ:206]

''اس کا جھوٹا وقار اُسے گناہ پر اُکساتا ہے۔''

اس مقام پر حَمَلَتْهُ (اُس نے اُسے اُکسایا) کی جگہ اَخَذَتْهُ (اُس نے اُس کو پکڑا) کا لفظ آ گیا ہے اور اس کے علاوہ عَلیٰ (پر) بِ (ساتھ) کا حرف آ گیا ہے۔

(9) ﴿ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿59﴾ ﴾ [الفرقان:59]

''پس تو اُس کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ۔''

اس مقام پر عَنْهُ (اُس کے بارے میں) کی جگہ بِهٖ (اُس کو۔ اُس کے ساتھ) کا حرف آ گیا ہے۔

(10) ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ﴾ [النساء:2]

''اور یتیموں کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔''

اس مقام پر صرف مَعَ (ساتھ) کی بجائے اِلیٰ (طرف) کا حرف آ گیا ہے۔

(11) ﴿ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ﴾ [المائدہ:6]

''اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو۔''

یہ وضو کی آیت کا ٹکڑا ہے۔ یہاں پر اِلیٰ (تک) کا حرف دراصل مَعَ (ساتھ) کے معنوں میں ہے۔ گویا ''تک'' کی بجائے ''سمیت'' کے معنی مراد ہیں۔

(12) ﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ [الدھر:6]

''ایک چشمے سے اللہ کے نیک بندے پئیں گے۔''

اس آیت میں مِنْهَا (اُس سے) کی جگہ بِهَا (اُس کے ساتھ) آ گیا ہے۔

(13) ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ط ﴾ [الانعام:92]

''اور انہوں نے اللہ کو صحیح نہیں پہچانا جب انہوں نے کہا کہ اللہ کے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔''

اس مقام پر اَنْ (کیا) کی جگہ اِذْ (جب) کا حرف آ گیا ہے۔

جملے کی جملے سے تبدیلی کا اُسلوب:

قرآن مجید میں بعض اوقات ایک پورا فقرہ حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے جملے کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔ یہ ایسے مواقع پر ہوا ہے جب دوسرا فقرہ پہلے فقرے کے مفہوم کو ادا کر دیتا ہے اور اس کے بارے میں اشارہ بھی کر دیتا ہے، اس تبدیلی سے مفہوم بھی ادا ہو جاتا ہے اور عبارت بھی مختصر ہو جاتی ہے۔

اس اسلوب کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ط ﴾ [البقرہ:220]

''اور اگر تم اُن کو اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ بھی تمہارے بھائی ہیں۔''

اصل مفہوم یہ ہے کہ اگر تم ان لوگوں سے ملو (اور خرچہ اکٹھا کر لو) تو کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں، اور بھائی تو بھائی سے ملتا ہی ہے۔ گویا اصل فقرہ یوں تھا کہ:

((اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ لَا بَأْسَ ذٰلِكَ لِاَنَّهُمْ اِخْوَانُكُمْ وَشَأْنُ الْاَخِ اَنْ يُّخَابِطَ اَخَاهُ))

''اگر تم ان سے ملو اور خرچہ اکٹھا رکھو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بھائی تو بھائی کے ساتھ ملتا ہی ہے۔''

لیکن آیت میں باقی عبارت کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر بھی پہلا فقرہ پورے مفہوم کو ادا کر دیتا ہے۔

(2) ﴿ لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ط ﴾ [البقرہ:103]

''تو ضرور اُنہیں اللہ کی طرف سے بہتر ثواب ملتا۔''

پورا مفہوم یوں تھا کہ:

((لَوَجَدُوْا ثَوَابًا وَ مَثُوْبَةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ))

''وہ ضرور ثواب پاتے اور اللہ کی طرف سے ملنے والا ثواب بہتر ہے۔''

یہاں پر بھی پہلے فقرے کو حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے فقرے کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے کیونکہ یہ فقرہ اپنے سے پہلے فقرے کے مفہوم کو بھی ادا کر دیتا ہے۔

(3) ﴿ اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ج ﴾ [یوسف:77]

''اگر اُس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اُس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی۔''

پورا مفہوم یوں تھا:

((اِنْ يَّسْرِقْ فَلَا عَجَبَ لِاَنَّهٗ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ))

''اگر اس نے چوری کی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس سے پہلے اس کے بھائی نے چوری کی تھی۔''

(4) ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [البقرہ:97]

”جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے تو جبرئیل وہ ہے جس نے اللہ کے حکم سے آپ ؐ کے دل پر قرآن نازل کیا۔“

اس کا پورا مفہوم یوں تھا کہ:

((مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيْلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لَّهٗ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِهٖ فَعَدُوُّهٗ يَسْتَحِقُّ أَنْ يُّعَادِيَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى))

”جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے تو بے شک اللہ اُس کا دشمن ہے کیونکہ جبرئیل نے اللہ کے حکم سے آپ ؐ کے دل پر قرآن نازل کیا ہے لہٰذا جو جبرئیل کا دشمن ہے وہ اسی کا حق دار ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اُسے اپنا دشمن قرار دے۔“

اسی طرح ایک لمبے فقرے کی جگہ ایک مختصر فقرے نے پورا مفہوم ادا کر دیا ہے۔

نکرہ کی جگہ معرفہ لانے کا اسلوب:

قرآن مجید میں یہ اسلوب بھی ملتا ہے کہ کسی جگہ اسم نکرہ کی جگہ اسم معرفہ استعمال ہوا ہے۔ اس کی دو مثالیں دیکھئے:

(1) ﴿ وَقِيْلِهٖ يَا رَبِّ ﴾ [الزخرف:88]

”اور اُس نے کہا: اے میرے رب!“

یہاں پر اصل میں قِيْلَ لَهٗ (اُس کو کہا گیا) تھا لیکن قِيْلِهٖ کا لفظ لانے سے کلام مختصر ہو گیا ہے۔

(2) ﴿ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿95﴾ ﴾ [الواقعة:95]

”بے شک یہ سب کچھ یقینی حق ہے۔“

یہ اصل میں حَقٌّ يَقِيْنٌ (یقینی حق) تھا۔ لیکن تلفظ (Pronunciation) کی سہولت کے لیے اسے حَقُّ الْيَقِيْن (یقین کا حق) کر دیا گیا۔

جنس اور تعداد میں تبدیلی کا اسلوب:

قرآنِ مجید میں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکر اسم کی جگہ مونث اسم لایا جاتا ہے۔ اسی

طرح کبھی واحد کی جگہ جمع کا اور کبھی جمع کی بجائے واحد کا اسم استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی فقرے کے اصل مفہوم کے مطابق ہوتی ہے۔

اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ فَلَمَّا رَاَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ج ﴾

[الانعام:79]

''پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔''

اس مقام پر هٰذِهٖ (یہ اشارہ مونث قریب) کی جگہ هٰذَا (یہ اشارہ مذکر قریب) آ گیا ہے۔

(2) ﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ج فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ط ﴾

[البقرة:17]

''ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی۔ پھر آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ اُن کی روشنی کو لے گیا۔''

اس مقام پر بِنُوْرِهٖ (اُس کی روشنی کو) کی بجائے بِنُوْرِهِمْ (اُن کی روشنی) آ گیا ہے۔ گویا واحد کی ضمیر کی جگہ جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔

اسی طرح کبھی تثنیہ (مثنّٰی) کی جگہ واحد اسم لایا جاتا ہے۔ اس کی بھی دو مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ج ﴾

[التوبه:74]

''اور انہوں نے یہی بدلہ دیا اس کا جو اللہ اور اُس کے رسولؐ نے اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دیا۔''

اس جگہ اَغْنٰی (اُس نے غنی کیا) واحد فعل ہے۔ اور اس کا فاعل لفظ اَللّٰهُ اور لفظ رَسُوْلُ دونوں ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فعل واحد کی بجائے تثنیہ ہونا چاہیے تھا۔

یعنی اَغْنَیَا (اُن دونوں نے غنی کیا۔) جو کہ استعمال نہیں ہوا۔ اسی طرح فَضْلِهٖ (اس کا فضل) میں ہٖ (اُس کا) کی ضمیر واحد ہے۔ حالانکہ اس کا مرجع تثنیہ ہے۔ یعنی ایک لفظ اَللّٰهُ اور دوسرا لفظ رَسُوْلُ. اس لحاظ سے ضمیر تثنیہ کی آنی چاہیے تھی۔ یعنی فَضْلِهِمَا (اُن دونوں کا فضل۔) لیکن چونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا معاملہ ایک جیسا تھا۔ اس لیے ضمیر واحد ہی لائی گئی۔

(2) ﴿ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَاٰتٰىنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ط ﴾ [ھود:28]

''اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل رکھتا ہوں اور اُس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت عطا کی اور وہ تم کو نظر نہیں آتی۔''

اس مقام پر فَعُمِّيَتْ (پس وہ نظر نہیں آتی) واحد کی جگہ فَعُمِّيَتَا (پس وہ دونوں نظر نہیں آتیں۔) تثنیہ آنا چاہیے تھا، لیکن چونکہ بَيِّنَةٌ (نشانی) اور رَحْمَةٌ (رحمت) کی ایک ہی حیثیت تھی۔ لہٰذا ان دونوں کے لیے ایک ہی فعل واحد لایا گیا۔

فقرے کے بعض حصوں میں تبدیلی کا اُسلوب:

قرآن میں ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ کبھی فقرے کے کسی حصے مثلاً شرط کے جوابِ شرط یا قسم کے جوابِ قسم وغیرہ کو حذف کر دیا جاتا ہے اور اُس کی جگہ کوئی اور مناسب فقرہ لایا جاتا ہے جو اس حذف کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

اس کی مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝1 وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝2 وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝3 فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝4 فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝5 يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝6 ﴾ [النازعات:1 تا 6]

''قسم ہے فرشتوں کی جو سختی سے جان نکالتے ہیں۔ قسم ہے فرشتوں کی جو نرمی سے جان نکالتے ہیں۔ قسم ہے فرشتوں کی جو تیز رفتاری سے چلتے ہیں۔ پھر

آگے بڑھ کر حکم مانتے ہیں۔ پھر حکم کے مطابق کام چلاتے ہیں۔ جس دن سخت زلزلہ آئے گا۔"

ان آیات میں شروع سے آخر تک قسمیں کھائی گئی ہیں۔ لیکن قسم کا جواب نہیں دیا گیا۔ بلکہ اسے حذف کردیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا مستقل جملہ " يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ "(جس دن سخت زلزلہ آئے گا۔) لایا گیا، جو حذف شدہ مفہوم کی طرف اشارہ کردیتا ہے۔قسم کا جواب یہ تھا کہ:"قیامت برحق ہے۔" لیکن اس کی جگہ ایک نیا جملہ لایا گیا:

(2) ﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿1﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿2﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴿3﴾ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ﴿4﴾ ﴾

[البروج: 1 تا 4]

"قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔ قسم ہے اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ قسم ہے گواہ کی اور اس کی جس کی گواہی دی گئی۔ خندق والے تباہ اور ہلاک ہوئے۔"

اس مقام پر بھی قسم کا جواب مذکور نہیں ہے، لیکن مفہوم یہی ہے کہ اعمال کا بدلہ برحق ہے۔

(3) ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿1﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿2﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿3﴾ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿4﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿5﴾ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿6﴾ ﴾ [الانشقاق: 1 تا 6]

"جب آسمان پھٹ جائے گا۔ اور وہ اپنے رب کا حکم مانے گا اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر نکالے گی اور خالی ہوجائے گی اور وہ اپنے رب کا حکم سن لے گی اور اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اے انسان! تو تکلیفیں اٹھا کر اپنے رب کی طرف جارہا ہے اور اُس سے ملنے والا ہے۔"

اس جگہ بھی مطلب یہی ہے کہ اعمال کا بدلہ اور حساب کتاب یقینی ہے، لیکن صرف شرط

کا ذکر ہے اور اس کی جزا یعنی شرط کا جواب مذکور نہیں۔

ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی تبدیلی:

قرآن مجید میں بعض مقامات پر ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی تبدیلی پائی جاتی ہے۔ مثلاً کبھی فقرے میں کبھی حاضر یا مخاطب کا صیغہ استعمال ہوتا ہے، لیکن پھر اسے غائب کے صیغے میں بدل دیا جاتا ہے۔ جیسے:

(1) ﴿ حَتّٰی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ج وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ ﴾

[یونس:22]

''یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ موافق ہوا سے لے کر ان کو چلتی ہے۔''

اس مقام پر پہلے حاضر یا مخاطب کا صیغہ تھا، پھر جَرَیْنَ (وہ چلتی ہیں) سے اسے غائب کے صیغے میں بدل دیا گیا ہے۔

(2) ﴿ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ط ﴾

[الملك:15]

''وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھا رکھا ہے، پس تم اس کے راستوں پر چلو۔''

اس جگہ لفظ اِمْشُوْا (تم چلو) آیا ہے جو کہ فعل امر ہے، حالانکہ اصل میں لِتَمْشُوْا (تا کہ تم چلو) تھا، جو کہ فعل مضارع تھا۔ گویا اس مقام پر فعل مضارع کی جگہ فعل امر استعمال ہوا ہے۔

(3) ﴿ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (278) ﴾

[البقرہ:278]

''اور سود جو باقی رہ گیا ہے، اُسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔''

یہ فقرہ اصل میں یوں تھا: اِیْمَانُکُمْ یَقْتَضِیْ ھٰذَا ''تمہارے ایمان کا یہی تقاضا ہے۔''

(4) ﴿ مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ ج كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ط ﴾

[المائدہ:32]

''اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے لکھ دیا۔''

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بنی آدم (آدم کے بیٹوں) کی حالت دیکھ کر ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کر دیا۔

یہاں پر مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کے الفاظ آدم کے بیٹوں کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔

(5) ﴿ قَالَ اَرَءَيْتَ ﴾ [الکھف:63]

''اس نے کہا: کیا تو نے دیکھا؟''

اس اسلوب میں دیکھنا مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ مخاطب کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں:

''کیا آپ نے سنا؟'' ''کیا آپ نے دیکھا؟'' اس سے ہماری مراد نہ تو سوال ہے، نہ سننا ہے اور نہ دیکھنا۔ بلکہ صرف دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

تقدیم وتاخیر:

قرآن مجید کے بعض مقامات میں تقدیم و تاخیر کا اسلوب پایا جاتا ہے۔ اس طرح بعض الفاظ یا مضامین پہلے کی بجائے بعد میں یا بعد کی بجائے پہلے آ جاتے ہیں، جس سے بات کو سمجھنا کچھ مشکل سا ہوتا ہے۔

کبھی کوئی لفظ اپنے مجازی معنوں میں یا دور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جس کی طرف ذہن جلدی منتقل نہیں ہوتا اور اصل مفہوم سمجھنے میں بظاہر دقت ہوتی ہے۔

اسی طرح کئی اور اسباب ہیں، جن کی وجہ سے کسی جگہ آیت کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آ جاتی ہے۔

اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ اِلَّا اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿59﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ؕ ﴾
[الحجر:59،60]

''سوائے لوط کے خاندان کے۔ بے شک ہم ان سب کو بچالیں گے۔ سوائے اس کی بیوی کے۔''

اس مقام پر پہلے اِلَّا (مگر۔ سوائے) آیا۔ پھر آخر میں اِلَّا کا لفظ آ گیا۔ اس طرح ایک ہی جگہ دو مستثنیٰ (Exceptions) آ گئے جس سے مفہوم کو سمجھنا آسان نہ رہا۔

(2) ﴿ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ﴿7﴾ ﴾ [التین:7]

''پس تو کیوں بدلے کے دن کو جھٹلاتا ہے۔''

اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ مشکل ہے کہ اس سے پہلے ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ (بے شک ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔) کا مضمون آیا ہے۔ اور ان دونوں آیتوں کے مضامین میں بظاہر کوئی ربط (Relation) نظر نہیں آتا۔

(3) ﴿ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ ﴾ [الحج:13]

''وہ پکارتا ہے اس کو جس کے فائدے سے زیادہ اُس کا نقصان واضح ہے۔''

اس جگہ مَنْ (کون) کی بجائے لَمَنْ (ضرور کون) آ گیا ہے، جس کی وجہ سے اصل مفہوم سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔

(4) ﴿ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ؕ ﴾ [القصص:76]

''ضرور طاقت ور مردوں کا گروہ تھک جاتا تھا۔''

یہ اصل میں فقرہ یوں تھا کہ: ﴿ لَتَنُوْٓءُ الْعُصْبَةُ بِهَا ﴾ ''ضرور گروہ تھک جاتا تھا، اس سے'' لیکن قرآن کے اندازِ بیان سے اصل مفہوم کو سمجھنا کچھ مشکل ہو گیا۔

(5) ﴿ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴿6﴾ ﴾
[المائدہ:6]

''اور مسح کرو اپنے سروں کا اور پاؤں اپنے ٹخنوں تک۔''

بظاہر اس کا ترجمہ یہ ہوتا کہ اپنے سروں اور اپنے پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرلو۔ لیکن اصل مفہوم یہ ہے کہ اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولو۔ اس مفہوم کو سمجھنے میں مشکل یہ ہے کہ اَرْجُلَکُمْ (تمہارے پاؤں) کا تعلق دُور کے فعل اِغْسِلُوْا (تم دھولو) سے ہے۔ لیکن جو فعل قریب تھا، اُسی سے اُس کا تعلق جوڑ دیا گیا، جس سے مطلب سمجھنا کچھ مشکل ہوگیا۔

(6) ﴿ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ [طٰہٰ:129]

''اور اگر آپ کے رب کی طرف سے بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی اور مقررہ مہلت نہ ہوتی تو فیصلہ ہو جاتا۔''

اس مقام پر یہ مشکل ہے کہ بعض الفاظ کی ترتیب بدل گئی ہے۔ اصل فقرہ یوں تھا:

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى لَكَانَ لِزَامًا

(اس کا ترجمہ وہی ہے جو اُوپر گزر چکا)

(7) ﴿ اِنْ لَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴾ [التوبہ: 73]

''اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ پھیلے گا اور بڑا فساد ہوگا۔''

اس جگہ یہ مشکل ہے کہ اس سے پہلے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ ﴿ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ ﴾ (تو تم پر اُن کی مدد کرنا لازم ہے) تو ان دونوں فقروں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

(8) ﴿ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ ﴾ [الممتحنہ:4]

''مگر ابراہیمؑ کی بات جو انہوں نے اپنے باپ سے کہی''

اس مقام کی مشکل یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی پہلے یہ آیت بھی آئی ہے کہ ﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ج ﴾ [الممتحنہ:4]

''بے شک تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں کی زندگیوں میں۔''

اوران دونوں مقامات کے باہمی ربط و تعلق (Relationship) کو سمجھنا مشکل ہے۔

(9) ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ط ﴾ [الاعراف:187]

''وہ آپؐ سے پوچھتے ہیں جیسے آپؐ اُس سے واقف ہیں۔''

اس جگہ کی مشکل یہ ہے کہ اس کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ اصل میں فقرہ یوں تھا کہ: يَسْئَلُوْنَكَ عَنْهَا كَاَنَّكَ حَفِيٌّ (وہ پوچھتے ہیں آپؐ سے اُس کے بارے میں گویا آپؐ واقف ہیں۔)

عام قاعدے کے خلاف اُسلوب:

قرآن مجید میں بعض آیات کو سمجھنے میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہاں عام قاعدے اور گریمر (Grammar) کے خلاف بات ہوتی ہے۔

اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ ﴾ [الانعام:38]

''اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اُڑتا ہے۔''

یہاں پر طائر (پرندے) کی جو صفت لائی گئی ہے، وہ عام قاعدے سے ہٹ کر ہے۔ اس لیے اسے سمجھنے میں مشکل ہے۔

(2) ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿27﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿27﴾ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿27﴾ ﴾ [.....؟.....]

''بے شک انسان کم حوصلہ پیدا کیا گیا ہے۔ جب اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے۔ اور جب اُسے خوش حالی ملے تو بخل کرتا ہے۔''

یہاں پر بھی انسان کی جو مختلف صفات بیان ہوئی ہیں اُن کو سمجھنے میں کچھ دشواری ہے۔

(3) ﴿ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ ﴾ [الاعراف:75]

''اُن کو جو کمزور بنائے گئے تھے، اُن کو جو اُن میں سے ایمان لائے تھے۔''

اس مقام کی مشکل یہ ہے کہ یہاں پر جن کو کمزور کہا گیا ہے وہی ہیں جن کو ایمان والے کہا گیا ہے۔

(4) ﴿ حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ﴾ [الاحقاف:15]

''یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا یعنی چالیس برس کا ہو گیا۔''

اس مقام پر اشکال ہے کہ یہاں پر وَ (واوٗ) تفسیر یہ یعنی تشریح کے لیے آئی ہے اور اس طرح دوسرا فقرہ پہلے فقرے کی وضاحت کرتا ہے۔ لیکن اگر اس واوٗ کو عطف یعنی ''اور'' کے معنوں میں لیا جائے تو مطلب سمجھنا مشکل ہے۔

(5) ﴿ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ﴾ [یونس:66]

''اور جو لوگ اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں وہ محض اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔''

یہاں پر اشکال یہ ہے کہ يَتَّبِعُ (وہ پیروی کرتا ہے) اور يَتَّبِعُوْنَ (وہ پیروی کرتے ہیں) کے فعل کی تکرار آ گئی ہے جس کے دوبارہ آنے سے مفہوم کو سمجھنا کچھ مشکل ہو گیا ہے۔

اصل مطلب یوں ہے:

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ اِلَّا الظَّنَّ

''اس کا ترجمہ بھی وہی ہے جو اُوپر بیان ہوا۔''

(6) ﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ لا وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ج فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ﴾ [البقرہ:89]

''اور جب ان لوگوں کے پس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آ گئی جو اس کتاب کو سچا کرنے والی یہ جو اُن کے ہاں پہلے سے موجود تھی اور وہ اس سے پہلے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگتے تھے۔ پھر جب وہ چیز آ گئی تو اُسے پہچاننے کے بعد اُس کا انکار کر دیا۔''

چونکہ اس مقام پر لَمَّا جَآءَ دوبار آیا ہے اس لیے اس کا مطلب سمجھنے میں کچھ دقت ہوتی ہے۔

(7) ﴿ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ [النساء:9]

''اور چاہیے کہ وہ ڈریں کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے چھوٹے بچے چھوڑ کر مرتے تو اُن کے لیے اُنہیں کتنی فکر ہوتی۔ لہٰذا اُنہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

اس آیت میں مشکل یہ ہے کہ س میں ''ڈرنے'' کے فعل کی تکرار (Repititon) پائی جاتی ہے جس سے مطلب سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔

(8) ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾ [البقرہ:189]

''وہ آپؐ سے چاندوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے! وہ لوگوں کے لیے اوقات ہیں اور حج کے لیے۔''

اس مقام پر اشکال یہ ہے کہ کلام کو پھیلا دیا گیا ہے اور مختصر طور پر یوں نہیں فرمایا گیا کہ: هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ فِيْ حَجِّهِمْ (وہ لوگوں کے لیے اُن کے حج کے اوقات ہیں۔)

لیکن کلام کی وسعت کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ چاند صرف حج کے دنوں کو جاننے کے ذریعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں دنوں، مہینوں اور برسوں کی گنتی جاننے کا ذریعہ بھی ہے۔

(9) ﴿ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾

[الشوریٰ:7]

''اور تا کہ آپؐ مکے والوں کو اور اُس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں اور حشر کے دن سے ڈرائیں۔''

اس جگہ یہ مشکل ہے کہ تُنْذِرَ (تو ڈرائے) کا لفظ دو بار آیا ہے۔ بظاہر یہ دونوں فقرے الگ الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں دونوں ایک ہیں اور اس طرح ہیں:

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى يَوْمَ الْجَمْعِ (تا کہ مکے والوں کو اس دن سے ڈرایا جائے جس دن سب لوگ جمع کیے جائیں گے۔)

(10) ﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾

[النمل:88]

''اور تو پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ وہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں حالاں کہ بادلوں کی طرح چلے جا رہے ہوں گے۔''

اس مقام پر تَحْسَبُهَا (تو اُن کو گمان کرے گا) کا لفظ زائد معلوم ہوتا ہے جس سے آیت کا مطلب سمجھنا مشکل نظر آتا ہے لیکن چونکہ تَرٰى (رؤیت۔ دیکھنا) لفظ کے اور بھی معنی ہیں اس لیے تَحْسَبُهَا (تو اُن کو گمان کرے گا) کے لفظ سے دیکھنے کے معنی متعین کر دیے گئے ہیں۔

(11) ﴿ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا ۢ بَيْنَهُمْ ج فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ط وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (213) ﴾

[البقرہ:213]

”لوگ ایک ہی اُمت تھے، پھر اللہ نے اُن کی طرف نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے۔ اُن کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کے فیصلہ کردیں۔ یہ اختلاف اُن لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی اور واضح ہدایت کے باوجود اُنہوں نے اختلاف کیا باہمی ضد کی وجہ سے۔ پھر اللہ نے ایمان والوں کو اپنے فضل سے حق بات کی راہ دکھادی۔“

اس جگہ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ (اور نہیں اختلاف کیا اس میں مگر اُن لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی) کا اضافہ کر دیا گیا تاکہ بعد میں لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (جس میں انہوں نے اختلاف کیا) کے فعل کی ضمیر کو واضح کر دیا جائے کہ یہ اختلاف صرف اُس قوم میں ہوا جس کے پاس کتاب بھیجی گئی، اور یہ اختلاف بھی کتاب نازل ہونے کے بعد پیدا کیا گیا، پھر اس اختلاف کی اصل وجہ بیان فرمائی کہ وہ کتاب کی بعض باتوں کو مانتے اور بعض کو نہیں مانتے تھے۔

ایک اور قرآنی اُسلوب:

قرآن میں بعض مقامات پر فاعل یا مفعول کو اصل حالت میں رکھنے کی بجائے اس پر کسی حرفِ جار کا اضافہ کر دیا گیا ہے، جیسے:

(1) ﴿ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ﴾ [التوبہ:35]

”جس دن اسی کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔“

اس جگہ عَلَيْهَا (اُسی پر) کو هِيَ (وہ) کی جگہ لایا گیا ہے اور اس سے تاکید کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔

(2) ﴿ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ﴾ [المائدہ:46]

”اور ان کے پیچھے بعد میں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔“

اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اصل الفاظ یہی کافی تھے کہ: ﴿ وَقَفَّيْنَا هُمْ بِعِيْسَى

ابْنِ مَرْيَمَ ﴾ ''اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو ان کے پیچھے بھیجا۔'' لیکن مضمون میں تاکید پیدا کرنے کے لیے پہلا اسلوب اختیار کیا گیا۔

واؤ کا استعمال:

حرف وَ (واؤ) اکثر عطف یعنی ''اور'' کے معنوں میں آتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ ان معنوں میں نہیں آتا، بلکہ بعض دوسرے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مثال کے طور پر:

(1) ﴿ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿1﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿2﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿3﴾ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ﴿4﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿5﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴿6﴾ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿7﴾ ﴾

[الواقعة: 1 تا 7]

''جب قیامت واقع ہوگی۔ اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں۔ وہ کسی کو گرائے گی، کسی کو اٹھائے گی۔ جب زمین ہلائی جائے گی۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ وہ گرد وغبار کی طرح ہوں گے۔ پھر تم تین گروہ بن جاؤ گے۔''

ں مقام پر وَّكُنْتُمْ میں واؤ عطف کے لیے نہیں ہے، بلکہ حالیہ ہے، جو ملانے اور تاکید کے لیے آتا ہے۔

(2) ﴿ ..... وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ﴾ [الزمر: 73]

''جب کہ اس کے دروازے کھلے ہوں گے۔''

اس جگہ واؤ عطف کے لیے نہیں ہے، بلکہ حالیہ (جبکہ۔ حالانکہ) کے معنوں میں ہے۔

(3) ﴿ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿141﴾ ﴾

[آل عمران: 141]

''جبکہ اللہ ایمان والوں کو چھانٹ لے اور کافروں کا زور توڑے۔''

یہاں پر بھی وَ (واؤ) عطف کے لیے نہیں آئی ہے، بلکہ حالیہ ہے۔

ف کا استعمال:

اسی طرح قرآن مجید مین کبھی ف (فا) زائدہ بھی ہوتا ہے، جس کا ترجمہ نہیں کیا جاتا، بلکہ صرف کلام میں حسن اور خوبصورتی پیدا کرنے کے لیا آتا ہے۔

علامہ قسطلانی نے "کتاب الحج" کی تشریح میں جہاں یہ بحث کی ہے کہ کیا عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع واجب ہے یا نہیں؟ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"اگر صفت اور موصوف کے درمیان تاکید پیدا کرنی ہو، تو ان دونوں کے درمیان میں حرف عطف لانا بھی جائز ہے۔"

جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿ اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ ط ﴾

[الانفال:49]

"جب منافق لوگ جن کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ کہہ رہے تھے۔"

مذکورہ آیت میں وَ (واوَ) آجانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین اور لوگ ہیں اور جن کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ دوسرے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ہی گروہ مراد ہے اور دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے کی صفت کے طور پر ایا ہے۔ یہاں پر وَ (واوَ) دراصل کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے آیا ہے۔

مشہور نحوی (Grammarian) سیبویہ نے اسی آیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس آیت کا اسلوب وہی ہے، جو درج ذیل فقرے کا ہے:

((مَرَرْتُ بِزَیْدٍ وَصَاحِبِكَ))

"میں زید اور تمہارے دوست کے پاس سے گذرا۔"

اس فقرے میں "تمہارے دوست" سے زید بھی مراد ہوسکتا ہے۔ اور جملے میں زَیْدٌ (زید) موصوف ہوگا اور صَاحِبِكَ (تمہارا ساتھی) اس کی صفت ہوجائے گی، حالانکہ

دونوں کے درمیان واؤ(وَ) موجود ہے۔

اسی طرح علامہ زمخشری نے درج ذیل آیت:

﴿ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿4﴾ ﴾

[الحجر:4]

''اور ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا، اس کی تباہی کا ایک مقررہ وقت لکھا ہوا تھا۔''

کے بارے میں اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

اس فقرے میں قَرْيَةٍ موصوف ہے اور وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (اور اس کے لیے ایک مقررہ وقت لکھا ہوا تھا۔) اس کی صفت ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو وَ (واؤ) ہے، وہ تاکید کے معنوں میں ہے۔ ''اور'' کے معنوں میں نہیں ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیت میں ہے:

﴿ وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿208﴾ ﴾

[الشعراء:208]

''اور ہم نے جتنی بستیاں بھی ہلاک کیں، پہلے ان میں ڈرانے والے بھیجے۔''

اس مقام پر اِلَّا (مگر) کا حرف صفت اور موصوف کے درمیان واسطہ ہے۔ یہاں بھی صفت اور موصوف کے درمیان تعلق کی پرزور تاکید ہے۔ اس کی مثال یہ ہے:

((جَآءَنِیْ زَیْدٌ عَلَیْهِ ثَوْبٌ))

''زید میرے پاس کپڑا (چادر) اوڑھے ہوئے آیا۔''

اور اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے:

((جَآءَ نِیْ وَعَلَیْهِ ثَوْبٌ))

''وہ میرے پاس آیا اور وہ کپڑا (چادر) اوڑھے ہوا تھا۔''

مذکور بالا دونوں فقروں میں وَ (واؤ) کا فرق ہے۔ ورنہ معنی کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

ضمیر کا دُور ہونا (انتشارِ ضمائر):

قرآنِ مجید میں بعض مقامات کو سمجھنے مین ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ ضمیروں کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کن اسموں کے لیے آئی ہیں۔ اس کی مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف:37]

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے: ''اور بے شک وہ ضرور ان کی سیدھی راہ سے روکتے ہیں اور وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔''

اس آیت میں تین ضمیریں آئی ہیں اور تینوں غیر متعین ہیں۔ اس لیے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون سی ضمیر کس اسم کے لیے آئی ہے۔ اگر ضمیروں کو متعین کر دیا جائے تو آیت یوں بنتی ہے:

((اِنَّ الشياطين ليصدون الناس عن السبيل ويحسب الناس انهم مهتدون))

''بے شک شیاطین لوگوں کو سیدھی راہ سے روکتے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔''

اسی طرح قرآنِ مجید میں قَالَ قَرِيْنُهٗ (اس کے ساتھی نے کہا) ان میں سے ایک جگہ شیطان مراد ہے۔ اور دوسری جگہ فرشتہ۔ لیکن یہ مثال ایک لفظ سے دو معنی مراد لینے کی ہے۔ ان دونوں مقامات کی تفصیل یہ ہے:

(ا) ﴿ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿27﴾ ﴾ [قٓ:27]

''اس کا ساتھی شیطان کہے گا: اے ہمارے رب! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا، یہ خود انتہائی گمراہی میں تھا۔''

(ب) ﴿ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿23﴾ ﴾ [قٓ:23]

''اوراس کا ساتھی فرشتہ کہے گا کہ اے اللہ! اس شخص کا اعمال نامہ حاضر ہے۔''

(2) ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ ...... (215) ﴾ [البقرة:215]

''وہ آپؐ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں مال کہاں خرچ کریں، کہہ دیجئے جو مال تم خرچ کروتو والدین کے لیے۔......''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ [البقرة:219]

''اور وہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کون سا مال خرچ کریں، کہہ دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو۔''

ان دونوں آیات میں پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مال جس مصرف میں بھی خرچ کرو گے وہ بہتر ہے۔ یہ مفہوم اس سوال کے مطابق ہے جو پوچھا گیا تھا کہ مال کا مصرف کیا ہے۔اوراسے کہاں خرچ کیا جائے۔

دوسری آیت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کا تعلق مال کی مقدار سے ہے۔ اس لیے اس کا یہ جواب دیا گیا کہ جو مال ضروریات سے زائد ہو، اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

اسی طرح بعض الفاظ قرآن کے مختلف مقامات پر مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، جن کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ جَعَلَ ﴾ (اُس نے بنایا) کبھی خَلَقَ (اس نے پیدا کیا) کے معنوں میں آتا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ ﴾ [الانعام:1]

''تعریف اس اللہ کے لیے ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور

اندھیرے اور روشنی کو پیدا کیا۔"

(2) جَعَلَ کبھی اِعْتَقَدَ (اس نے اعتقاد کیا) کے معنی دیتا ہے، یعنی یہ اس کا عقیدہ ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَءَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ ط...... ﴾

[الانعام:136]

"اور اللہ نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ان کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ ہے کہ......"

اسی طرح شَیْءٌ (شے۔ چیز) کا لفظ کبھی فاعل، کبھی مفعول اور کبھی مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے، جیسے:

(1) ﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ (35) ﴾

[الطور:35]

"کیا وہ بغیر کسی شے کے پیدا ہو گئے، یا وہ خود خالق ہیں۔"

اس جگہ شَیْءٍ کا لفظ خالق کے معنوں میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا وہ بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے ہیں۔

(2) ﴿ فَلَا تَسْئَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ ط ﴾ [الکھف:70]

"تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہ پوچھنا۔"

مطلب یہ ہے کہ مجھ سے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرو، جس پر میرے کسی اہم کام کا انحصار ہو۔

قرآنِ مجید میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خبر کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن مراد خبر نہیں ہوتی، بلکہ وہ واقعہ مراد ہوتا ہے، جس سے اس خبر کا تعلق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿ قُلْ هُوَ...... نَبَؤٌا عَظِيْمٌ (67) ﴾ [صٓ:67]

"کہہ دیجئے! وہ بڑی خبر ہے۔"

لیکن اس ''بڑی خبر'' سے مراد وہ عجیب وغریب واقعہ ہے، جس کے بارے میں یہ الفاظ فرمائے گئے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں خَیرٌ (بھلائی) اور شَرٌّ (برائی) کے الفاظ مختلف مقامات پر معنی دیتے ہیں اور ہر جگہ یہ مشکل ہے کہ پتہ نہیں چلتا، اس جگہ کون سے معنی مراد ہیں۔

آیتوں کے مضامین کا منتشر اور بے ربط معلوم ہونا:

قرآن مجید میں آیات اور ان کے مضامین کا منتشر اور بے ربط ہونا بھی ایک مشکل معاملہ ہے۔ بعض اوقات ایک آیت کا مضمون کسی اور جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ کسی اور مقام پر بیان ہوئی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت کو کسی خاص جگہ پر آنا چاہیے تھا، لیکن وہ کسی دوسرے مقام پر آجاتی ہے، جس سے اس کا مفہوم سمجھنا آسان نہیں رہتا۔

مثال کے طور پر کسی آیت کو کسی قصے کے آخر میں ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ قصے کے شروع میں بیان ہوگئی ہے اور پھر قصے کا آغاز ہوتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آیت جو پہلے نازل ہوئی تھی وہ قرآن میں بعد میں آتی ہے اور جو بعد میں نازل ہوئی وہ پہلے آجاتی ہے۔ یہ صورتِ حال بھی عبارت کا مضمون سمجھنے میں دشواری پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیت پہلے نازل ہوئی تھی:

﴿ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ..... ﴿144﴾ ﴾

[البقرة:144]

''اے نبیؐ! ہم آپ کا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھتا دیکھتے ہیں۔......''

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی تھی:

﴿ سَیَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ ..... ﴿142﴾ ﴾ [البقرة:152]

''بے وقوف لوگ کہیں گے......''

لیکن یہ دوسری آیت قرانِ مجید کی موجودہ ترتیب اور تلاوت میں پہلے آگئی ہے، جس

سے مفہوم سمجھنے میں دقت پیدا ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کافروں کی کوئی بات بیان ہو رہی ہوتی ہے اور درمیان ہی میں اس کا جواب دے دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اصل بات پوری کی جاتی ہے۔ یوں سوال و جواب کے آپس میں گڈمڈ ہونے سے مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً یہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ وَلَا تُؤْمِنُوْا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ ؕ...... (73) ﴾ [آل عمران:173]

"اور کسی پر یقین نہ کرو، سوائے اس کے جو تمہارے دین پر چلے۔ کہہ دیجیے اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے کہ وہ کسی کو دے جیسے تم کو اس نے دیا۔......"

اس آیت میں " قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ "(کہہ دیجیے بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے) کافروں کی بات کا جواب ہے، لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد کافروں کی بات بیان ہوئی ہے۔ کلام کی ترتیب سے اصل مفہوم میں کچھ اُلجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن فہمی کی راہ میں جو مشکلات اور رکاوٹیں حائل ہیں، ان کو چند صفحات مین بیان نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ہم نے اب تک اس پر جتنی گفتگو کی ہے، اس سے اکثر مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور اگر ان کو ذہن نشین کر لیا جائے تو ان کی روشنی میں باقی اشکالات کا حل بھی آسانی سے نکالا جاسکتا ہے۔

(5) محکم اور متشابہ آیات:

قرآن مجید میں محکم اور متشابہ دونوں قسم کی آیتیں موجود ہیں۔

محکم آیات (محکمات) سے وہ آیتیں مراد ہیں، جن کا مفہوم اور مطلب سمجھنے کے لیے عربی زبان کے کسی ماہر کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن اس بارے میں عربی زبان جاننے کا معیار قدیم اہل عرب کی زبان کا معیار ہے، وہ معیار ہر گز نہیں ہے، جو ہمارے زمانے کے لوگوں نے قائم کر رکھا ہے اور جنھوں نے بالکل واضح آیات کو بھی اتنا مشکل اور پیچیدہ بنا دیا

ہے کہ صاف سامنے کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔

متشابہ آیات (متشابہات) وہ ہیں، جن کے ایک سے زیادہ مطالب ہو سکتے ہیں اور جب تک کوئی واضح دلیل یا قرینہ موجود نہ ہو ان کا مطلب متعین نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر یہ الجھن اس وقت بھی پیدا ہوتی ہے جب ایک ہی ضمیر کا تعلق دو مختلف اسموں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکتا ہو اور دونوں کی حیثیت برابر ہونے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس ضمیر کا کس اسم سے تعلق ہے اور اس کا مرجع کیا ہے؟ جیسے کوئی کہے کہ:

((اَمَا اِنَّ الْاَمِيْرَ اَمَرَنِیْ اَنْ اَلْعَنَ فُلَانًا ، لَعَنَهُ اللّٰهُ))

''امیر نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فلاں آدمی پر لعنت کروں، اللہ اس پر لعنت کرے۔''

اس عبارت میں ''اللہ اس پر لعنت کرے'' کا فقرہ ایسا ہے، جس کا تعلق حکم دینے والے امیر سے بھی ہو سکتا ہے اور اس آدمی سے بھی ہو سکتا ہے جسے لعنت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب ان دونوں میں سے اصل میں کون مراد ہے اس کا انحصار صرف کہنے والے کی نیت پر ہے۔ بظاہر اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

متشابہ آیات کے حوالے سے کبھی یہ مشکل پیش آتی ہے کہ کسی آیت میں کوئی ایسا لفظ مستعمل ہوتا ہے، جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں کی حیثیت برابر ہوتی ہے۔ جیسے:

﴿ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ط ﴾ [المائدہ:6]

''یا تم نے بیویوں کو ہاتھ لگایا ہو۔''

اس مقام پر لفظ لٰمَسْتُمْ (تم نے ہاتھ لگایا) کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک ''چھونے یا ہاتھ لگانے کے'' اور دوسرے ''ہم بستری کرنے کے۔'' اور ان دونوں معنوں میں سے ہر ایک کے معنی برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک کوئی قرینہ یا دلیل موجود نہ ہو، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فقرے میں کوئی ایسا لفظ آ جاتا ہے جس کا تعلق دو مختلف فقروں

میں سے کسی ایک کے ساتھ ہوسکتا ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ اصل میں ان دونوں میں سے کس فقرے کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ مثال کے طور پر آیت وضو میں ہے کہ:

﴿ ..... وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ج..... ﴾

[المائدہ:6]

''اور مسح کرو اپنے سروں کا اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھولو یا مسح کرو۔)''

اس آیت میں یہ واضح نہیں ہوتا کہ '' اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ''(اور پاؤں ٹخنوں تک) کا تعلق اِغْسِلُوْا (دھونے) سے ہے یا اِمْسَحُوْا (مسح کرنے) سے ہے۔ اس لیے اس آیت سے یہ اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ وضو میں پاؤں کا مسح کرنا چاہیے۔ یا ان کو دھونا چاہیے۔ پھر جب تک کوئی قرینہ یا دلیل موجود نہ ہو، اس اختلاف کو دور کر کے کوئی ایک مطلب نہیں لیا جاسکتا۔

اسی طرح قرآن میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فلاں فقرہ پہلے فقرے ہی کا ایک حصہ ہے، یا الگ سے نیا جملہ ہے۔ مثلاً:

﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ م وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ ط..... ﴾

[آل عمران:7]

''اور اس کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور جو پختہ علم والے ہیں......''

اس آیت میں '' وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ ''(اور پختہ علم والے) کے ٹکڑے کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا تعلق پہلے فقرے سے ہے، یا ایک الگ فقرہ ہے، کیونکہ یہاں ان دونوں باتوں کا امکان اور احتمال ہے، پھر جب تک کوئی دلیل یا قرینہ موجود نہ اس الجھن کو حل کرنا مشکل ہے۔

کنایہ:

کنایہ کے معنی ہیں کلام میں کوئی ایسی بات کہی جائے جو اصل میں مقصود نہ ہو، لیکن

سننے والے کا ذہن اس کی طرف ایک نتیجے کے طور پر خود بخود منتقل ہو جائے۔ مثلاً کہا جائے:

((هُوَ عَظِيْمُ الرِّمَادِ)) ''اس کے چولہے سے راکھ بہت نکلتی ہے۔''

اس کے لازمی اور مرادی معنی یہ ہیں کہ وہ بڑا مہمان نواز ہے اور لوگوں کو خوب کھلاتا پلاتا ہے۔ کیونکہ اسی صورت میں زیادہ کھانا پک سکتا ہے، زیادہ لکڑی جل سکتی ہے اور بہت زیادہ راکھ نکل سکتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

(1) ﴿ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ط ﴾ [المائدہ: 64]

''بلکہ اس (اللہ) کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔''

اور اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا سخی اور فیاض ہے۔

کنائے کا یہ اسلوب اس وقت بھی ہوتا ہے، جب کسی غیر مادی اور غیر محسوس چیز کو کسی مادی (Material) اور محسوس چیز سے تشبیہ دے کر بیان کیا جائے، لیکن اس تشبیہ کی وضاحت نہ کی جائے۔ یہ اصل میں استعارہ ہوتا ہے، لیکن کنائے کے انداز میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کا اسلوب قدیم عربوں کے اشعار اور خطبات میں عام تھا۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں بھی کنائے کے اس اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

(2) ﴿ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ ..... ﴾

[بنی اسرائیل: 64]

''اور تو ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا۔''

اس آیت میں شیطان کو ڈاکوؤں اور چوروں کے ایک ایسے سردار سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے ساتھیوں کو حکم دے رہا ہو کہ تم ادھر سے حملہ کرو اور تم ادھر سے پل پڑو۔

(3) ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿8﴾ وَجَعَلْنَا مِنْ م بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿9﴾ ﴾ [یٰسٓ: 8،9]

''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک آ گئے ہیں، جس سے ان کی گردنیں اکڑی ہوئی ہیں اور سر اونچے ہو رہے ہیں۔ ہم نے ان کے آگے بھی ایک آڑ کردی ہے اور ان کے پیچھے بھی ایک آڑ کردی ہے پھر ہم نے انہیں ڈھانپ دیا ہے، جس کے بعد انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

اس آیت میں کفار کے اس رویے کی تصویر کھینچی گئی ہے جو انہوں نے قرآن کی آیتوں کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا، جب وہ ان سے اعراض کرتے اور منہ پھیر لیتے تھے، گویا یہ ایسے لوگ ہیں جن کے چاروں طرف دیوار کھینچ دی گئی ہو اور انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے وہ نہ کچھ دیکھ سکتے ہوں اور نہ اپنی جگہ سے ہل سکتے ہوں۔

(4) ﴿ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ﴾ [القصص:32]

''اور اپنا خوف دور کرنے کے لیے بازو کو اپنے ساتھ ملا لو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اطمینان رکھو، گھبراؤ نہیں۔

عربوں کے کلام میں کنائے کے اس انداز کی مثالیں عام ہیں۔ وہ جب کسی بہادر کی تعریف کرتے ہیں تو تلوار کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے ہیں کہ:

''وہ کبھی اسے یوں مارتا ہے اور کبھی یوں مارتا ہے۔''

مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ بڑا بہادر ہے، اگرچہ اس نے ساری عمر کبھی تلوار ہاتھ میں نہ پکڑی ہو۔ کبھی یوں کہا کرتے کہ: ''دنیا میں کوئی نہیں جو میرا مقابلہ کر سکے۔''

کبھی یوں کہتے: ''فلاں شخص یوں کام کرتا ہے۔'' اور اشارہ اس طرح کرتے، جیسے کوئی لڑائی میں اپنے حریف (Rival) پر قابو پائے ہوئے ہو، اگرچہ اس شخص نے خود کبھی کوئی ایسی بات نہ کہی ہو۔

کبھی یوں کہتے: ''فلاں شخص نے میرا گلا گھونٹ دیا ہے۔''

کبھی کہہ دیتے: ''فلاں آدمی نے میرے حلق میں انگلیاں ڈال کر لقمہ نکال لیا ہے۔''

ظاہر ہے اس طرح کے فقروں سے وہ مفہوم مراد نہیں ہوتا جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

بلکہ اس طرح کے محاورے اور روزمرے خود ہماری زبان میں بھی عام ہیں۔

تعریض:

تعریض سے مراد کوئی ایسی عام بات کہنا ہے جو کسی بھی شخص کے بارے میں ہوسکتی ہو، لیکن اس سے مقصد کسی خاص آدمی کی طرف اشارہ ہو یا اسے متوجہ کرنا ہو۔ ایسے موقع پر اس آدمی کے کچھ اوصاف بیان کردیے جاتے ہیں، جس سے سننے والا اس بات کا مقصد سمجھ لیتا ہے۔

قرآنِ مجید میں جہاں کہیں تعریض کا اسلوب آیا ہے، وہاں اس واقعے یا قصے کی جاننے کی ضرورت پیش آتی ہے، جس کا ذکر ان آیات میں کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب کسی شخص کے بارے میں ناپسندیدگی یا ناگواری کا اظہار فرماتے ،تو اس کا نام لیے بغیر یوں فرمایا کرتے تھے۔

((مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَفْعَلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا))

''ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے، یہ کیا حرکتیں کررہے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿36﴾ ﴾ [الأحزاب:36]

''کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردیں تو پھر ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی گمراہی میں جا پڑے گا۔''

اس آیت میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی کے واقعے کی طرف

اشارہ ہے۔اسی طرح درج ذیل آیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ ..... ﴾ [النور:22]

"اور تم میں سے جو لوگ فضل والے اور وسعت والے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ داروں کو کچھ نہ دیں گے۔"

قرآن مجید اس طرح کے مقامات کو سمجھنے کے لیے ان کے اصل واقعات کا علم ہونا ضروری ہے۔

مجاز عقلی:

"مجاز عقلی" سے مراد یہ ہے کہ کسی فعل کو کسی ایسے فاعل کی طرف منسوب کر دیا جائے جو حقیقت میں اس کا فاعل نہ ہو، یا کسی ایسی چیز کو مفعول قرار دیا جائے، جو اصل میں مفعول نہ ہو۔اس طرح کا انداز وہاں اختیار کیا جاتا ہے، جہاں فعل اور اس کے غیر حقیقی فاعل میں یا مفعول میں کسی قسم کی کوئی مناسبت پائی جاتی ہو۔ یا بات کرنے والا، جس کام کے بارے میں دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے وہ کام کیا ہے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا فاعل وغیرہ ہوتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ:" بَنَى الْأَمِيْرُ الْقَصْرَ " (امیر نے محل بنایا۔) حالانکہ امیر خود محل تعمیر نہیں کرتا۔ یہ کام معمار اور مزدور کرتے ہیں۔اسی طرح کہا جاتا ہے کہ:" اَنْبَتَ الرَّبِيْعُ الْبَقْلَ " (بہار نے سبزہ اگایا۔) حالانکہ بہار سبزہ نہیں اگاتی۔ اللہ تعالیٰ بہار کے موسم میں سبزہ اگاتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں بھی اس اسلوب کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

باب 8

قرآن کا انوکھا اور دلکش اسلوب

قرآنِ مجید اپنے اسلوبِ بیان (Style) اور نظم و ترتیب کے لحاظ سے بالکل منفرد (Unique) کتاب ہے۔ اسے ابواب اور عنوانات کے لحاظ سے اس طرح تقسیم نہیں کیا گیا، کہ ہر مضمون کو الگ الگ بیان کردیا گیا ہو، بلکہ قرآن ایسے خطوط اور فرامین (Orders) کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے جس طرح کے خطوط اور فرامین بادشاہ اپنی رعایا کی طرف کبھی کبھی بھیجتے ہیں۔ اور مختلف حالات میں مختلف قسم کے احکامات صادر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں ان سب کا ایک مجموعہ تیار ہوجائے، جسے کوئی شخص مدوّن اور مرتب (Edite) کردے۔

بالکل اسی طرح شہنشاہِ حقیقی نے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے حضرت محمد ﷺ کی طرف ایک سورت کے بعد دوسری سورت نازل فرمائی۔ حضورؐ کے زمانے میں ہر سورت کو الگ الگ لکھ کر محفوظ کیا گیا تھا۔ تمام سورتیں اکٹھی اور یکجا نہ تھیں۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان تمام سورتوں کو ایک جلد میں خاص ترتیب سے مرتب کیا گیا اور اسے مصحف کا نام دیا گیا۔

صحابہ کرام نے اپنے طور پر قرآنی سورتوں کو درج ذیل چار قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا:

1۔ سبع طوال:...... اس میں قرآن کی سات بڑی اور طویل سورتیں شامل تھیں۔

2۔ مئین:...... اس میں وہ تمام سورتیں شامل تھیں جن کی آیتوں کی تعداد سو (100) یا سو سے زیادہ ہے۔

3۔ مثانی:......اس میں ایسی سورتیں شامل تھیں، جن میں آیات کی تعداد ایک سو (100) سے کم تھی۔

4۔ مفصل:......اس میں مذکورہ پہلی تین قسموں کے سوا باقی تمام سورتیں شامل تھیں۔

قرآنِ مجید کی باقاعدہ تدوین و ترتیب کے زمانے تک سورتوں کی یہی تقسیم تھی، لیکن جب قرآن کو مرتب اور مدوّن کیا گیا تو اس تقسیم میں بھی تبدیلی آ گئی اور دو یا تین مثانی سورتوں کو ان کے سیاق وسباق (Context) اور مفہوم (Meaning) کے لحاظ سے مئین میں شامل کیا گیا۔ اس طرح دوسری اقسام میں بھی معمولی ردّ و بدل ہوا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس مصحف کی چند نقلیں (Copies) کرائی گئیں جو ملک کے تمام علاقوں میں بھیجی گئیں، تاکہ سب لوگ صرف اسی کی پیروی کریں۔

چونکہ قرآن کی سورتوں کا اسلوب بالکل بادشاہوں کے خطوط اور فرامین جیسا تھا، اس لیے ان سورتوں کی ابتداء اور انتہا میں خطوط اور فرامین کا سا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

مثلاً بعض خطوط کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سے ہوتا ہے۔ کسی کے شروع میں اس کا مقصد اور اس کی غرض و غایت (Purpose) بیان کی جاتی ہے۔ بعض کی ابتدا میں بھیجنے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ بعض میں اس کا نام لکھا جاتا ہے، جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہے۔ بعض خطوط کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔ پھر کوئی طویل ہوتا ہے اور کوئی مختصر۔

بالکل یہی انداز اللہ تعالیٰ نے اپنی سورتوں کے لیے اختیار کیا ہے۔ کسی سورت کا آغاز حمد وثنا سے کیا ہے۔ کسی میں مقصد اور غرض و غایت بیان کی ہے۔ جیسے ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝٢ ﴾

[البقرة:2]

''یہ کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔''

یا جیسے فرمایا گیا:

﴿ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا ط ...... ﴿1﴾ ﴾ [النور:1]

"یہ ایک سورت ہے جو ہم نے نازل کی ہے اور ہم نے اس کے احکام ضروری ٹھہرائے ہیں۔......"

یہ وہی انداز ہے جو ہمیں عام تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی تحریر کے شروع میں یوں لکھا ہوتا ہے:

((هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ فُلَانٌ وَ فُلَانٌ))

"یہ وہ تحریر ہے، جس پر فلاں اور فلاں نے مصالحت کی ہے۔"

یا جیسے یوں لکھ دیتے ہیں کہ:

((هٰذَا مَا اَوْصٰى بِهٖ فُلَانٌ))

"یہ وہ تحریر ہے، جس کی فلاں شخص نے وصیت کی ہے۔"

خود رسول اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر جو عہد نامہ لکھوایا تھا، اس کے شروع میں یہ الفاظ تھے:

((هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ))

"یہ وہ عہد نامہ ہے، جسے حضرت محمد ﷺ نے منظور فرمایا ہے۔":

جن سورتوں میں خط بھیجنے والے اور جس کی طرف خط بھیجا جائے اس کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿2﴾ ﴾ [الجاثیہ:2]

"یہ کتاب اس اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، جو زبردست اور حکمت والا ہے۔"

(2) ﴿ الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿1﴾ ﴾ [ھود:1]

''الف، لام، را۔ یہ کتاب ہے۔ اس کی آیتیں محکم اور مفصل ہیں۔ یہ دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے ہے۔''

ان سورتوں کی ابتدائی آیات کا انداز کچھ اس قسم کی تحریروں سے ملتا جلتا ہے:

''حضرت خلافت (خلیفہ) کا حکم صادر ہوا۔''

یا جیسے: ''فلاں شہر کے باشندوں کو حضرت خلافت (خلیفہ) کی اطلاع پہنچا دی گئی۔''

رسول اللہ ﷺ روم کے بادشاہ ہرقل (Hercules) کے نام جو خط بھیجا تھا، اس کی ابتدا بھی ان الفاظ سے کی گئی تھی:

((مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ (ﷺ) اِلٰی هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ))

''اللہ کے رسول محمد (ﷺ) کی طرف سے بادشاہِ روم ہرقل کے نام۔''

قرآن کی بعض سورتیں مختصر تحریروں اور رقعوں کے انداز میں بغیر کسی عنوان کے ہیں۔ جیسے:

(1) ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ ..... ﴿1﴾ ﴾ [المنافقون:1]

''اے نبیؐ! جب آپؐ کے پاس منافق لوگ آئیں......''

(2) ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ ..... ﴿1﴾ ﴾ [المجادلة:1]

''بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی۔......''

(3) ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ج ﴿1﴾ ﴾

[التحريم:1]

''اے نبیؐ! آپؐ کیوں اس چیز کو حرام قرار دیتے ہیں، جو اللہ نے آپؐ کے لیے حلال ٹھہرائی ہے۔''

عربوں کا فصیح ترین کلام ان کے قصیدے تھے، جن میں اصل مقصد سے پہلے تمہید ہوتی تھی جو تشبیب کے انداز میں تھی اور اس میں عجیب وغریب مقامات اور حیرت انگیز واقعات کا ذکر کیا جاتا تھا۔ قرآنِ مجید کی بعض سورتوں کا انداز بھی اسی طرح کا ہے۔ جیسے:

(1) ﴿ وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا ﴿1﴾ ﴾ [الصافات:1]

''قسم ہے صف باندھنے والوں کی صف باندھ کر۔''

(2) ﴿ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿1﴾ ﴾ [التکویر:1]

''جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔''

اسی طرح بعض خطوط کے آخر میں جامع فقرے اور اچھی نصیحتیں لکھی جاتی تھیں۔ بعض کے اختتام پر پہلے مذکورہ احکام کی تاکید ہوتی تھی۔ کبھی ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو تنبیہ کی جاتی تھی۔ اسی اسلوب پر قرآن میں سورتوں کے خاتمے پر کبھی کوئی جامع فقرہ، کبھی پہلے مذکورہ احکام کی تاکید اور کبھی کسی نافرمانی پر کوئی تنبیہ ہوتی ہے۔

اسی طرح کبھی کسی سورت کے شروع میں ڈرانے والی آیات ہوتی ہیں۔ پھر درمیان میں ایسی آیتیں آجاتی ہیں، جن میں عظیم الشان اور مفید مضامین کو نہایت عمدہ اور فصیح و بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کی نعمتوں اور اس کے احسانات کا ذکر بھی اسی اسلوب میں ہوتا ہے۔ جیسے ایک سورت کا آغاز خالق و مخلوق کے درمیان فرق و امتیاز سے ہوتا ہے اور پھر اس کے درمیان میں یہ آیتیں ہیں:

﴿ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ط ءٰٓاللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿59﴾ ﴾ [النمل:59]

''کہہ دیجیے شکر ہے اللہ کا اور سلام ہے اللہ کے منتخب بندوں پر۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔''

اور اس کے بعد پانچ آیات میں اسی مضمون کو نہایت فصیح اور موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہی اسلوب سورۂ البقرہ میں اس جگہ موجود ہے، جہاں بنی اسرائیل سے مباحثہ و مخاصمہ کرتے ہوئے ابتدا میں یہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿47﴾ ﴾ [البقرہ.47]

''اے بنی اسرائیل! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے، خاص طور پر جو میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔''

پھر اس مباحثے اور مناظرے کو ختم بھی اسی آیت پر کیا گیا:

﴿ يَا بَنِيٓ اِسۡرَآئِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّيۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿122﴾ ﴾ [البقرہ:122]

''اے بنی اسرائیل! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے، خاص طور پر جو میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔''

ظاہر ہے مباحثے کا آغاز اور اختتام ایک ہی آیت سے کرنا فصاحت و بلاغت کا کمال ہے۔ اسی طرح سورۂ آل عمران میں اہل کتاب سے مباحثہ ومخاصمہ کرتے ہوئے آغاز میں فرمایا:

﴿ اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ط ﴿19﴾ ﴾ [آل عمران:19]

''بے شک اللہ کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے۔''

پھر چونکہ اہل کتاب سے سچے دین کی بات ہو رہی تھی، اس لیے مباحثے کا آغاز ہی اس دعوے سے کیا گیا کہ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچا دین اسلام ہے۔'' تاکہ مباحثے کا عنوان ذہن میں رہے اور ساری بحث اسی حوالے سے کی جائے۔

قرآن میں نغمگی اور آہنگ (Rythm):

قرآن مجید میں سورتوں کی آیات کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے، جیسے کسی قصیدے کو مختلف اشعار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان دونوں کے اندازِ بیان میں واضح فرق ہے۔ لیکن ایک چیز دونوں میں مشترک (Common) ہے کہ اشعار ہوں یا قرآنی آیات دونوں کو محض لطف اندوزی کے لیے نہ پڑھا جائے۔

اشعار اور آیات میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ شعر کے لیے وزن اور قافیے کی پابندی ہے۔ عربی شاعری میں یہ اوزان اور قوانی مشہور نحوی خلیل نے مرتب کیے تھے۔ دوسرے

شعراء نے اسی سے علم عروض سیکھا تھا۔ لیکن اس کے برعکس قرآنی آیات میں ہمیں جو قافیہ اور سجع ملتا ہے وہ شاعری کے مصنوعی قافیے، بحر اور وزن سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے وہ انسانی فطرت کے زیادہ قریب اور اس سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

عربی اشعار اور قرآنی آیات میں جو چیزیں مشترک ہیں، ان پر بحث کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ جن باتوں میں ان دونوں میں فرق و امتیاز ہے، ان پر بحث کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

وزن اور آہنگ سے فطری مناسبت:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شاعری جو کہ موزون اور مقفّٰی کلام ہوتا ہے اس سے ہر سلیم الفطرت شخص لطف اندوز ہوتا ہے اور اس میں ایک خاص کشش اور لذت محسوس کرتا ہے۔ اس کا سبب دو مصرعوں کے درمیان وہ صوتی آہنگ (Harmony) ہے، جو فطری طور پر ہر پڑھنے سننے والے کو محظوظ کرتا اور اس کا اشتیاق بڑھاتا ہے۔ وہ اسی طرح کا مزید موزوں یا ہم آہنگ کلام سننا چاہتا ہے۔ پھر جب کوئی عمدہ موزون کلام سامنے آتا ہے تو طبیعت مچل جاتی ہے۔ اگر موزون اشعار کے ساتھ قافیہ آرائی بھی ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ شعر سے دلچسپی کا راز انسانی فطرت کے اندر پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ہر ملک اور علاقے کا رہنے والا اگر ذوقِ سلیم رکھتا ہے تو شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وزن اور قافیہ اضافی چیز ہے:

شاعری سے وابستگی (Attachment) کے باوجود ہر ملک و قوم میں وزن اور قافیے کا تصور ایک جیسا نہیں ہے، بلکہ اس بارے میں ہمیں الگ الگ معیار ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کی شاعری کے اصول اور ضابطے دوسری سے مختلف ہیں۔

عربی شاعری ان قاعدوں اور ضابطوں کی پابند ہے، جسے خلیل نحوی نے مرتب کیا تھا۔ ہندوستانیوں کے ہاں شاعری کے الگ اوزان اور قافیے ہیں جو ان کے مزاج سے مناسبت

رکھتے ہیں۔ پھر ہر زمانے میں شاعری کے قواعد وضوابط (Rules & Regulations) میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہر طرح کی شاعری کے اصول وقواعد اور وزن و قافیہ کو سامنے رکھا جائے تو ان میں کوئی ایک چیز بھی مشترک نظر نہیں آئے گی، بلکہ محض اندازے سے ہم ان میں بعض مشترک چیزیں تلاش کرسکیں گے۔

عربی اور فارسی شاعری کے اصول:

وزن اور قافیے کے معاملے میں عرب شعراء کے ہاں جتنی آزادیاں ہیں، فارسی شاعروں کے ہاں اس بارے میں اتنی ہی زیادہ پابندیاں ہیں۔ اہل عرب کے ہاں شعر کے وزن میں تھوڑی بہت تبدیلی کوئی عیب نہیں۔ مثلاً ان کے ہاں شعر کے وزن میں " مُسْتَفْعِلُنْ" کی جگہ " مُفَاعِلُنْ " اور" مُفْتَعِلُنْ " کا استعمال بھی جائز ہے۔ وہ" فَاعِلاتُنْ "اور " فِعْلاتُنْ " کو ہم وزن سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے حشو وزوائد اور زحافات کو بھی جائز قرار دیتے ہیں اور اپنے اشعار میں بے تکلفی سے یہ تبدیلیاں کرلیتے ہیں۔

اس کے برعکس فارسی شعراء نہ تو وزن میں کوئی تبدیلی گوارا کرتے ہیں اور نہ کسی قسم کے زحافات کو جائز قرار دیتے ہیں۔

یہی حال قافیے کا ہے۔ عربی شاعری میں لفظ" قُبُوْرٌ "کا قافیہ " مُنِيْرٌ "ہوسکتا ہے، لیکن فارسی شاعری میں یہ ممنوع ہے۔

عرب شعراء حاصل، داخل اور نازل جیسے الفاظ کو ایک ہی قسم قرار دیتے ہیں، لیکن فارسی شعراء اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ (مترجم کی رائے میں ایسا کوئی اختلاف نہیں) اسی طرح عربی شاعری میں کسی لفظ کے دوٹکڑے کرکے اسے الگ الگ مصرعوں میں استعمال کرلینا جائز ہے، لیکن فارسی (اور اُردو) شاعری میں ایسا کرنا جائز نہیں۔

غرض عربی اور فارسی شاعری میں وزن اور قافیہ ایک جیسا ہونے کے باوجود حقیقت میں ایک جیسا نہیں۔

ہندی شاعری کے اصول:

اہل ہند کی شاعری کے اصول عربوں اور ایرانیوں دونوں سے مختلف ہیں۔ ہندوستان نے اپنی شاعری کے لیے جو اوزان مقرر کیے، ان میں صرف حروف کی تعداد کا خیال رکھا گیا ہے اور ان کی حرکات وسکنات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ لیکن اس کے باوجود ان اوزان میں بھی ایک لطف اور لذت ہے۔ میں نے اکثر دیہاتیوں کو شعر کہتے سنا ہے جو اپنے لطف کے لیے تک بندیاں کرتے ہیں۔ یہ ردیف کبھی ایک لفظ کی ہوتی ہے۔ اور کبھی ایک سے زیادہ الفاظ کی۔ اس کے باوجود وہ جو وزن اور قافیہ اختیار کرتے ہیں اس کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ نظم کو بھی قصیدے کی طرح پڑھتے ہیں اور اسی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اس طرح ہر قوم نے اپنے لیے شاعری کے الگ الگ اصول اور قاعدے مقرر کر رکھے ہیں، جو ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود خاص ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ہم آہنگی بھی کچھ اضافی (Relative) چیز ہے کوئی حقیقی شے نہیں۔

موسیقی کے اصولوں میں اختلاف:

انسان شاعری کی طرح نغمے اور گیت سے بھی فطری طور پر مانوس ہے۔ سب لوگ موسیقی سے یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں بھی ان کے درمیان اختلافات موجود ہیں۔ یونانیوں (Greeks) نے اپنی موسیقی کے لیے جو قاعدے اور اصول بنائے اور شاعری کے لیے جو اوزان مقرر کیے، ان کو ''مقامات'' کا نام دیا۔ پھر ان مقامات کو بنیادی اصول قرار دے کر ان سے مختلف قسم کی شاخیں اور سریں (Tunes) ایجاد کیں اور اسے ایک مستقل فن کی حیثیت دی۔

اس کے برعکس ہندوستانیوں نے اپنی موسیقی کے چھ (6) اصول مقرر کیے۔ ان کو راگ کا نام دیا۔ ان چھ راگوں سے الگ الگ بہت سی راگنیاں نکال لی ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں موسیقی کو ایک فن کا درجہ حاصل ہے۔ اس طرح ہندی موسیقی یونانی موسیقی سے مختلف

ہوگئی ہے۔

لیکن ہم نے دیہاتیوں کو دیکھا ہے، جنھوں نے ہندوستانی اور یونانی موسیقی دونوں سے اپنی راہ الگ نکال رکھی ہے۔ وہ اپنے مزاج اور فطری سلیقے سے گیت بناتے ہیں۔ پھر اصول اور قاعدے کے بغیر ہی گاتے، بجاتے اور شوروغوغا کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس سے اسی طرح محظوظ ہوتے ہیں جیسے کوئی یونانی یا ہندوستانی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

جب ہم ان تمام چیزوں پر غور کرتے ہیں اور موسیقی کے مختلف انداز اور ان میں بعض مشترکہ خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ شاعری کی طرح موسیقی کے مختلف اصول وقواعد میں بھی جو مشابہت پائی جاتی ہے وہ حقیقی نہیں، بلکہ ایک اضافی چیز ہے۔

بحث کا خلاصہ:

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی شاعری اور موسیقی میں جو مناسبت اور مشابہت پائی جاتی ہے وہ غیر حقیقی اور اضافی (Relative) چیز ہے۔ اصل میں جو چیز ان سب کے ہاں ایک جیسی اور مشترک ہے وہ ایک سرسری سا وزن اور آہنگ ہے۔ جسے ''شعریت'' یا ''شاعری کا دلکش احساس'' کہا جاسکتا ہے۔ اسی میں شعر اور موسیقی کی دلکشی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی چیز شعر اور موسیقی کی جان ہے۔ ہر ذوقِ سلیم رکھنے والا اسی کو پسند کرتا ہے، جس میں اصولوں اور بحروں کی پابندی نہیں۔

یہی سبب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس خاکی انسان سے کلام کرنا چاہا تو اس نے اسی سرسری وزن اور آہنگ کو جسے ہم نے شعریت اور موسیقی کے دلکش احساس کا نام دیا ہے، اختیار کیا ہے جو سب کے ہاں پسندیدہ اور مرغوب تھا۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ نے اپنے کلام کی بنیاد شعر اور موسیقی کے ان اصول وقواعد پر نہیں رکھی جو مختلف قوموں میں الگ الگ تھے، بلکہ اس نے ان کے درمیان مشترک وزن و آہنگ اور شعریت کو اختیار کیا۔ پھر اسے خوش اسلوبی سے بلکہ معجزانہ طور پر کام میں لایا گیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے شاعری اور موسیقی کے

تمام مصنوعی اور تغیر پذیر اصولوں اور ضابطوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جو انسان کی ناقص عقل کی سوچ کا نتیجہ تھے۔

آیات کا وزن اور اصول:

قرآنی آیات کا وزن اور ان کا اصول دنیا کے تمام مروجہ ضابطوں سے الگ ہے۔
اس کا اپنا ایک مخصوص اسلوب (Style) ہے جو اپنا جداگانہ اصول رکھتا ہے۔
چنانچہ مختلف سورتوں کی آیات میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے ان میں ایک مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں وزن اور آہنگ کے لیے سانس اور آواز کو معیار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے لیے اس نے شاعری کے اوزان مثلاً بحر طویل یا بحر مدید کی طرح کے لگے بندھے اوزان کا سہارا نہیں لیا۔ قرآن کا قافیہ بھی شاعری کا قافیہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک سانس کا دورانیہ (Duration) جس لفظ پر ختم ہوتا ہے وہی لفظ اس آیت کا قافیہ بن گیا ہے، اگرچہ وہ ہمارے مصنوعی قافیوں کی شرطوں کے مطابق نہیں۔

قرآن کے وزن اور قافیہ کی یہ نہایت مختصر تعریف ہے جس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ سانس لینا انسان کی فطرت ہے۔ اگرچہ اسے گھٹانا اور بڑھانا اس کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنی مرضی سے چھوٹا یا لمبا سانس لے سکتا ہے۔ لیکن اگر سانس کے اس عمل کو فطری حالت پر رہنے دیا جائے تو اس کی آمد و رفت ایک خاص دورانیے کی پابند رہے گی۔ جب انسان ایک بار سانس لیتا ہے تو اسے ایک خاص قسم کی خوشگوار حالت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ خوشگوار کیفیت آہستہ آہستہ کم ہونے کے بعد بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرا سانس لینے کی ضرورت پیش آتی، اسی طرح سانس کے آنے جانے کا یہ دورانیہ اگرچہ مقرر نہیں ہے اور اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، تاہم اس کا ایک خاص اندازہ پایا جاتا ہے۔ اگر فقرے کی بنیاد سانس کے دورانیے پر رکھی جائے تو مختلف فقروں کے درمیان دو تین الفاظ سے زیادہ کا فرق نہیں پڑے گا، بلکہ یہ فرق کم بھی ہو سکتا ہے۔ اس معمولی فرق کی وجہ سے کوئی فقرہ اپنی حد

سے باہر نہیں چلا جاتا اور نہ بے وزن ہوتا ہے۔ پھر الفاظ کی تعداد میں اس کمی بیشی سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مختلف حروف کی حرکات میں ردّ و بدل کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے، جس سے شعر و موسیقی کے ضابطوں کی پابندی کے بغیر بھی کلام میں آہنگ اور وزن کا ایک مخصوص حسن پایا جاتا ہے۔

آیات کا وزن:

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید کی آیتوں میں سانس کے اسی عام اور اوسط دورانیے کو ان کے وزن کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ پھر اسے تین قسموں ......طویل، متوسط اور مختصر...... میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ طویل وزن کی مثال سورۂ النساء ہے۔ متوسط وزن کی مثال سورۂ الاعراف اور سورۂ الانعام ہے۔ مختصر کی مثال سورۂ الشعراء اور سورۂ الدخان ہیں۔

قرآنی آیات کے قافیے:

آیتوں کے وزن کی طرح ان کے قافیوں کا انحصار بھی سانس کے دورانیے پر ہے۔ سانس کا دورانیہ جس حرف پر جا کر ختم ہوتا ہے، وہی اس کا قافیہ ہے، جسے صرف اعلیٰ ذوق ہی محسوس کر سکتا ہے۔ پھر اس کی تکرار (Repitition) سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ اس قافیے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہر دفعہ ایک جیسے حروف ہوں، بلکہ مختلف حروف بھی ہم قافیہ ہو سکتے ہیں۔ جیسے ایک جگہ الف ہو، دوسری جگہ ب ہو، تیسری جگہ ج ہو، چوتھی جگہ ق ہو اور پانچویں جگہ واؤ ہو۔ یہ سب ہم قافیہ قرار پائیں گے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یَعْلَمُوْنَ، مُؤْمِنِیْنَ اور مُسْتَقِیْمٌ یہ تینوں الفاظ مختلف ہونے کے باوجود ہم قافیہ کہلا سکتے ہیں۔ اسی طرح خُرُوْجُ، مَرِیْجُ، تَحِیْدُ، تَبَارُ، فَوَاقُ اور عُجَابُ وغیرہ قرآنی الفاظ بظاہر ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن وہ بھی ہم قافیہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آیت کے آخر میں الف کا اضافہ بھی قافیے کا کام دیتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے کے حروف مختلف ہوں جیسے کَرِیْمًا، حَدِیْثًا اور بَصِیْرًا جیسے الفاظ

اپنے آخری حروف کے اختلاف کے باوجود صرف الف کی وجہ سے ہم قافیہ بن جائیں گے اور ان کا صوتی آہنگ خاص لذت دے گا، جیسا کہ سورۂ مریم اور سورۂ الفرقان میں اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا قافیے کے لیے حروف کے ایک جیسا ہونے کی شرط غیر ضروری ہے۔ لیکن اگر اس شرط کو مان لیا جائے کہ تمام آیتوں کے آخر میں ایک جیسے حروف آنے چاہئیں تو پھر سورۂ محمد کی آیتوں میں (م) کے حرف کی اور سورۂ الرحمٰن کی آیتوں میں (ن) کے حرف کی تکرار خاص لطف دیتی ہے۔

اسی طرح بعض سورتوں میں کسی ایک آیت کی تکرار بھی خاص لطف دیتی ہے جیسا کہ سورۂ الشعراء، سورۂ القمر، سورۂ الرحمٰن اور سورۂ المرسلات کا انداز ہے۔

قرآن کی بعض سورتوں میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سننے والے کو متوجہ کرنے کے لیے اور اسے کلام کی لطافت کا احساس دلانے کے لیے ان کی ابتدائی اور آخری آیتوں کے قافیے بدل دیے گئے ہیں، جیسا کہ سورۂ مریم کے آخر میں اِدًّا اور هَدًّا ہے۔ سورۂ الفرقان کے آخر میں سَلَامًا اور كِرَامًا ہے اور سورۂ صٓ کے آخر میں طِيْن، سٰجِدِيْنَ اور مُنْظَرِيْنَ آیا ہے۔ حالانکہ معلوم ہے کہ ان سورتوں کی ابتدائی آیات کے قافیے ان سے مختلف ہیں۔ عام طور پر قرآنِ مجید نے اپنے خاص انداز کے اس قافیے کا ہر جگہ اہتمام کیا ہے۔ بعض مقامات پر کوئی فقرہ شامل کرکے اس اسلوب کو برقرار رکھا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں کئی آیات کے آخر میں اس طرح کے فقرے ملتے ہیں:

﴿ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿18﴾ ﴾ [الانعام:18]

''اور وہ دانا اور باخبر ہے۔''

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿4﴾ ﴾ [الفتح:4]

''اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔''

﴿ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿11﴾ ﴾ [الفتح:11]

''بلکہ اللہ اس سے باخبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿21﴾ ﴾ [البقرة:21]

"تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿21﴾ ﴾

[الزمر:21]

"بے شک اس میں عقل والوں کے لیے یاددہانی ہے۔"

﴿ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿59﴾ ﴾ [الفرقان:59]

"پس تو اس کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ۔"

اسی مقصد کے لیے بعض جگہوں پر الفاظ کو آگے پیچھے لایا گیا ہے اور کبھی ان کے حروف میں اضافہ کر دیا ہے، جیسے: اِلْيَاسِيْنَ (الصافات : 130)، طُوْرِ سِيْنِيْنَ (التین : 2) جو اصل میں اِلْيَاسَ اور طُوْرِ سَيْنَاءَ تھا۔

چھوٹی اور بڑی آیات میں توازن:

قرآن میں بعض مقامات پر چھوٹی اور بڑی آیتیں ساتھ ساتھ آ گئی ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی عدم توازن نہیں ہے۔ بلکہ ایسی جگہوں پر مختصر اور طویل کلام کا امتزاج (Combination) ایک خاص لطف دیتا ہے۔ یا وہاں کوئی ضرب المثل بیان کی گئی ہے۔ یا کسی فقرے کو دہرایا گیا ہے، جس کی وجہ سے چھوٹی آیتیں بھی بڑی آیتوں کی ہم وزن ہو گئی ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں چھوٹے جملے ہیں اور آخر میں بڑے فقرے آ گئے ہیں لیکن وہاں بھی کلام کی شیرینی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر:

﴿ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿30﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿31﴾ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿32﴾ ﴾ [الحاقه:30 تا 32]

"پکڑو اسے پھر طوق پہنا دو اسے۔ پھر اسے لے جا کر دوزخ میں ڈال دو۔ پھر ایک زنجیر میں جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے اسے جکڑ دو۔"

ایسی آیتیں سننے والے لاشعوری طور پر پہلے دو فقروں کو ملا کر ایک پلڑے میں رکھتے ہیں اور تیسرے اور آخری فقرے کو دوسرے پلڑے میں، اس طرح دونوں کا وزن برابر ہو جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تین چھوٹے ابتدائی فقرے مل کر آخری چوتھے فقرے کے ہم وزن ہو جاتے ہیں۔ جیسے:

﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ج فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ قف اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿106﴾ ﴾ [آل عمران:106]

"جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہروں پر سیاہی چھا جائے گی۔ ان سے کہا جائے گا کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے۔ تو اب اپنے کفر کے بدلے میں عذاب چکھو۔"

لیکن جو لوگ اس نکتے کو نہیں جانتے وہ ایسے تمام فقروں کو ایک مسلسل اور طویل آیت سمجھ لیتے ہیں اور ان کی نگاہ الفاظ کے حسن توازن پر نہیں جاتی۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آیت میں دو فاصلے یا دو قافیے ہوتے ہیں جیسا کہ شاعری میں یہ صنعت استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر:

كَالزَّهْرِ فِي تَرَفٍ وَّ الْبَدْرِ فِىْ شَرَفٍ
وَالْبَحْرِ فِىْ كَرَمٍ وَّ الدَّهْرِ فِىْ هِمَمٍ

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو ایسی آیتیں ایک ساتھ ہوتی ہیں، جن میں سے ایک چھوٹی اور دوسری بڑی ہوتی ہے، لیکن ان دونوں میں بھی خاص توازن موجود ہوتا ہے، جو ان آیتوں کے اپنے اپنے انداز میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

اس نکتے کی وضاحت یہ ہے کہ جب ایک ایسا بہترین کلام جو وزن کی مناسبت اور قافیے کی رعایت سے لایا جاتا ہے تو اسے ایک پلڑے میں رکھا جاتا ہے اور دوسرے پلڑے میں ایسا

بہترین کلام رکھا جاتا ہے، جس میں سلاست، سادگی اور موزونیت ہوتی ہے تو انسانی فطرت اس پلڑے کو زیادہ وزن اور ترجیح دیتی ہے، جس میں مضمون کی بلندی اور معنویت زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر ایک قافیے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور دوسرے قافیے پر بات کو وزن کے ساتھ لا کر ختم کر دیا جاتا ہے تاکہ عبارت میں عدمِ توازن کا احساس نہ ہونے پائے۔

ایک وضاحت:

شروع میں کہا گیا تھا کہ قرآن کی بعض سورتوں میں ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس میں وزن اور قافیے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن جن سورتوں میں ایسا اسلوب موجود نہیں، وہاں وہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو باکمال خطیبوں کی تقریروں میں، یا دانشور لوگوں کے منہ سے نکلی ہوئی ضرب الامثال (Proverbs) میں پایا جاتا ہے۔ آپ نے عورتوں کی وہ کہانی سنی ہوگی جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی تھی۔ آپ نے اس کے قافیوں کا اندازہ بھی لگایا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس میں اس طرح کے وزن اور قافیے کا تصور نہیں پایا جاتا، جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں۔

پھر بعض سورتوں میں تقریر یا خطبے کی بجائے خط لکھنے کا اسلوب ہے۔ جو بالکل صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کوئی بناوٹ نہیں۔ یہ عام گفتگو کا بے تکلفانہ انداز ہے۔ پھر بات کو وہاں ختم کر دیا گیا ہے جہاں اسے فطری طور پر ختم ہونا چاہیے۔ اس اسلوب کی خوبی اور دلکشی کا راز یہ ہے کہ اہل عرب فطری طور پر بات چیت میں وہیں پر رکتے ہیں جہاں آ کر سانس ختم ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کلام کے اندر قدرتی طور پر ایک خاص طرح کا خوشگوار تناسب اور توازن پیدا ہو جاتا ہے، جس میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

یہی اسلوب قرآنِ مجید کی بعض سورتوں میں بھی اختیار کیا گیا ہے اور اسی اصول کے تحت ان سورتوں کی آیتوں کی تعداد رکھی گئی ہے۔

بہر حال یہ وہ باتیں ہیں جو میں سمجھ سکا ہوں اور اللہ بہتر جانتا ہے۔

قرآن میں مضامین کی تکرار:

قرآنِ مجید کا ایک اسلوب (Style) یہ ہے کہ اس میں ایک ہی مضمون کو کئی بار دہرایا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اسلوب کو اختیار کرنے میں بڑی حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم کسی کو کچھ بتانا یا سمجھانا چاہتے ہیں تو اس کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ وہ ہے جب مقصد یہ ہو کہ سننے والے کو وہ بات بتائی جائے جس سے وہ ابھی تک ناواقف ہے۔ ایسی صورت میں صرف ایک بار کہہ دینا کافی ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ ہم ایسے موقع پر اختیار کرتے ہیں جب ہم کسی بات کو سننے والے کے دل و دماغ پر نقش کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ وہ اس بات سے فائدہ اٹھائے اور اس کے رنگ میں پوری طرح رنگ جائے۔ جیسا کہ ہم کسی شعر کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد اسے بار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں انہی دو طریقوں کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ جہاں صرف کسی مضمون سے آگاہ کر دینا کافی تھا، اسے ایک آدھ مرتبہ بیان کر دیا گیا۔ مگر جہاں کسی مضمون کو دل و دماغ میں بٹھانا مقصود تھا، وہاں اسے بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قرآن کے کسی کم اہم مضمون کو بھی صرف ایک دفعہ پڑھنا سمجھنا کافی نہیں، بلکہ بار بار اس کی تلاوت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن میں مضامین کی تکرار کے باوجود ہر مقام پر یہ خیال رکھا گیا ہے کہ کسی مضمون کو بیان کرنے کے لیے ایک ہی عبارت نہ ہو، بلکہ ہر بار نئے الفاظ اور نئے اسلوب سے اس مضمون کا ذکر کیا جائے، تاکہ اس کی دل نشینی اور لطف آفرینی میں اضافہ ہو اور طبیعت میں اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔ اگر ایک جیسے الفاظ یا عبارت کو دہرا دیا جاتا تو اس تکرار کا اثر ختم ہو جاتا۔ لیکن ایک ہی مضمون ہر بار نئے انداز اور جدید اسلوب کے ساتھ آنے سے ذہن

اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس پر غور وفکر کرتا ہے۔ اسی طرح وہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

قرآنی مضامین کا غیر مرتب ہونا:

یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی سورت میں مختلف مضامین کو منتشر انداز میں کیوں بیان کیا گیا؟ ایسا کیوں نہ ہوا کہ تمام مضامین کو ترتیب وار لایا جاتا۔ مثلاً پہلے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں بیان ہوتیں۔ پھر ایام اللہ یعنی تاریخی واقعات کا ذکر ہوتا۔ پھر اس کے بعد کافروں سے مباحثہ کیا جاتا۔ اس طرح تمام مضامین ایک منطقی ترتیب کے ساتھ مذکور ہوتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کی قدرت سے کوئی چیز ناممکن نہ تھی۔ وہ چاہتا تو ہر مضمون کو ہماری منطقی اور عقلی ترتیب کے مطابق بیان کرسکتا تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک حکمت و مصلحت رکھی ہے، جس کا تعلق ان لوگوں سے ہے، جن کی طرف حضورؐ کو مبعوث کیا گیا اور جن کی طرف کتاب بھیجی گئی۔

قرآنِ مجید حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ اس کے پہلے مخاطب عرب لوگ تھے۔ ان کی زبان اور اسلوب میں اس حکمت اور مصلحت کو سامنے رکھا گیا، جو عربوں کے مزاج اور طبیعت سے مطابقت رکھتی تھی۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ ؕ (44) ﴾

[حٰمٓ السجدہ: 44]

”کیوں نہیں اس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئیں۔ کیا عجمی قرآن اور عربی رسولؐ؟“

میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دراصل قرآن کے نزول کے وقت عربوں کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، نہ الہامی اور نہ

کسی انسان کی لکھی ہوئی۔ لہٰذا جو ترتیب آج کتاب کے مصنفوں نے اختیار کی ہے اہل عرب اس سے بالکل ناواقف تھے۔ اگر ان شعراء کا کلام دیکھا جائے، جنہوں نے اسلام کا زمانہ پایا۔ یا اگر نبی ﷺ کے خطوط اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

اگر قرآن کی ترتیب کے لیے کوئی ایسا انداز اختیار کیا جاتا، جس سے اہل عرب واقف نہ ہوتے تو وہ اس قرآن کو سن کر اجنبیت (Strangeness) محسوس کرتے۔ ان کا ذہن الجھ کر رہ جاتا۔ وہ صاف صاف باتیں بھی سمجھ نہ پاتے۔

لیکن قرآن کا مقصد ان کو صرف کوئی بات سمجھا دینا یا کسی واقعے کی خبر پہنچا دینا نہ تھا، بلکہ اس کا مقصود یہ تھا کہ تمام باتیں ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا، جب ہر بات اچانک غیر متوقع طور پر سامنے آئے۔ سننے والا اسے سن کر چونک اٹھے۔ وہ اس پر پوری توجہ دے، تا کہ وہ بات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو جائے۔

ان دونوں مصلحتوں کی وجہ سے قرآن کے مضامین کا غیر مرتب اور بکھرا ہوا ہونا سمجھ میں آتا ہے۔

قرآن کا نرالا اسلوب:

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب قرآن میں وزن اور قافیے کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے تو پھر اس میں اسی وزن اور قافیے کو کیوں اختیار نہیں کیا گیا، جس کا رواج عربوں کی شاعری میں موجود تھا اور جو قرآن کے وزن اور قافیے سے زیادہ پر لطف ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لطف و دلکشی ایک اضافی (Relative) چیز ہے جو ہر قوم کے مزاج اور احوال سے مختلف ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ بحث فضول ہے کہ کیا چیز پر لطف ہے اور کیا نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کو معلوم تھا کہ حضرت محمد ﷺ اُمّی ہیں اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ جب آپ ﷺ کی طرف سے قرآن کی شکل میں وزن اور قافیے کا ایک نیا اسلوب

(Style) سامنے آیا تو یہ آپ کا معجزہ قرار پایا۔ گویا آپ کی نبوت و رسالت کو سچا ثابت کرنے والی دلیل سامنے آ گئی۔

اس کے برعکس اگر قرآن میں بھی عربی شاعری کے مروّجہ وزن اور قافیے کو اختیار کیا جاتا تو اہل عرب اسے اپنی شاعری جیسی چیز سمجھ کر اس کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوتے۔ پھر جیسا کہ اعلیٰ درجے کے شاعروں اور ادیبوں کا طریقہ ہے وہ اپنے ہم عصر (Contemporary) شعراء اور ادباء پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے نظم یا نثر میں اپنا نیا اسلوب (Style) ایجاد کرتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی اس طرح کی غزل کہہ کر دکھائے یا اس طرح کی تحریر و نگارش لکھے۔ عام لوگ بھی ان کی انفرادیت (individuality) کو محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کی عظمت کو مانتے ہیں۔ اگر عظیم شعراء و ادباء بھی پرانا گھسا پٹا اسلوب اختیار کریں تو سوائے ایک آدھ محقق و ناقد کے کوئی ان کو اہمیت نہ دے۔

قرآن کا اعجاز:

قرآنِ مجید کئی اعتبار سے معجزہ ہے اور اس کا اسلوبِ بیان (Style) بھی معجزہ ہے۔

اہل عرب کی فصاحت و بلاغت کے چار میدان تھے:

قصائد، خطبات (تقاریر)، خطوط اور محاورات (مکالمے۔)

وہ ان چاروں کے سوا نظم و نثر کے کسی اور اسلوب سے واقف نہ تھے۔ وہ کوئی نیا اسلوب ایجاد کرنے سے قاصر تھے۔ ظاہر ہے ان کے سامنے حضرت محمد ﷺ کا، جو کہ اُمّی تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، ایک نیا اور نرالا اسلوبِ بیان لے کر آنا واقعی معجزہ تھا۔

پھر قرآن اس لحاظ سے بھی معجزہ ہے کہ اس نے پہلی قوموں کے حالات ٹھیک ٹھیک بیان کیے ہیں۔ وہ اس اعتبار سے بھی معجزہ ہے کہ اس نے آیندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پیش گوئیاں کیں جو حرف بحرف سچ ثابت ہوئیں۔ اسی طرح وہ اپنی فصاحت و بلاغت کے پہلو سے بھی معجزہ ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کی بلندی تک پہنچنا کسی اور

کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم چونکہ عربی زبان و ادب کے قدیم دور کے بہت بعد میں پیدا ہوئے ہیں، اس لیے قرآن کی بلاغت سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔ لیکن اتنا جانتے ہیں کہ قرآن نے اپنے الفاظ اور تراکیب کو جس طرح بے تکلفی، بے ساختگی اور خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اس کی مثال عربوں کے قدیم اور جدید دور کے پورے ذخیرۂ کلام میں نہیں ملتی۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو سمجھنا عام لوگوں کے بس میں نہیں۔ صرف اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے بڑے بڑے شعراء اور ادباء ہی اسے محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے ہر قسم کے مضامین کو ادا کرنے کے لیے رنگا رنگ اسلوب اختیار کیے ہیں۔ وہ ایک ہی بات کو چاہے جتنی بار دہرائے، ہر بار اسے مختلف الفاظ کا جامہ پہنا کر نئے انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ غرض ہر سورت کا اندازِ بیان ایسا منفرد اور معجزانہ ہے کہ کوئی شخص اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۃ الاعراف، سورۂ ھود اور سورۃ الشعراء کے ان مقامات کو دیکھیں جہاں انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات و واقعات کو دہرا کر بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان کو سورۃ الصافات میں دیکھ لیں۔ اور آخر میں سورۃ الذاریات میں مشاہدہ کر لیں۔

صرف قصص و واقعات ہی میں نہیں، بلکہ قرآن میں جہاں کہیں نافرمانوں کے لیے عذاب اور فرماں برداروں کے لیے ثواب کا ذکر ملتا ہے، وہاں بھی ہر جگہ ایک نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جتنی مرتبہ جس مضمون کی تکرار ہوئی ہے، اتنی مرتبہ اسے نئے انداز سے بیان کیا ہے۔ حتّٰی کہ جن جگہوں پر دوزخیوں سے مباحثے اور ان کے باہمی جھگڑوں کا ذکر آیا ہے وہاں بھی ہر جگہ نئے اسلوب کی تازگی برقرار ہے۔ قرآنِ مجید میں اس اندازِ بیان کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔

پھر قرآن کے اعجاز کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے اپنی بلاغت کے لیے جن شعری اور ادبی وسائل سے کام لیا ہے وہ بھی منفرد اور بے مثال ہیں۔ تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز مرسل وغیرہ جن کی تفصیلات علم معانی اور علم بیان کی کتب میں دیکھی جاسکتی ہیں، ان کا

استعمال بھی ایسے انداز سے کیا ہے، جس سے بہتر انداز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس اسلوب سے عام آدمی بھی اتنا ہی متاثر ہوتا ہے، جتنا ایک ذہین اور باذوق شخص متاثر ہوتا ہے اور یہ خوبی قرآنِ حکیم کا معجزہ ہے۔ ؎

زِ فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

"میں اسے سر سے لے کر پاؤں تک جہاں بھی دیکھتا ہوں ہر جگہ کی خوبی میرے دل کا دامن کھینچ لیتی ہے کہ بس یہی جگہ ہے۔"

قرآن کے معجزہ ہونے کا ایک خاص پہلو وہ یہ ہے جسے صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو شریعت کے رازوں سے واقف ہیں۔ اور اس میں بیماریوں کی علامات (Symptoms)، امراض کی تشخیص (Prescription)، ان کے علاج اور دواؤں کے خواص (Chara-cteristics) کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کتاب کا لکھنے والا کوئی انتہائی ماہر طبیب ہے۔ عام آدمی اس کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

یہی حال قرآن کے مضامین و مطالب کا ہے جو انسان کی ہدایت کے لیے نازل ہوئے۔ ان مضامین کی عمدگی اور عظمت کا اندازہ عام آدمی نہیں کر سکتا۔ لیکن جو شخص شریعت کے علوم کا ماہر ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ انسانی ہدایت و رہنمائی کے لیے کیا کیا چیز ضروری ہے اور قرآن نے اسے اتنے عمدہ اور اعلیٰ طریقے سے بیان کیا ہے جس سے بہتر انداز میں اسے بیان کرنا ممکن نہیں۔ غرض قرآن کا اعجاز خود قرآن ہے: ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلت باید از وے رُو متاب

"سورج کی دلیل خود سورج ہے۔ اگر تجھے اس کی دلیل چاہیے تو اس سے منہ نہ موڑو۔"

باب 9

مفسّرین کے گروہ

قرآن کی تفسیر کرنے والے مفسّرین کے کئی گروہ ہیں:

1۔محدّثین:

یہ وہ گروہ ہے جو تفسیر میں ان واقعات اور قصوں کو بیان کرنا ضروری سمجھتا ہے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ لیکن یہ گروہ اس بات کی بالکل پروا نہیں کرتا کہ ان واقعات کی چھان بین اور تحقیق بھی کرے۔ وہ ہر واقعے کو نقل کر دیتے ہیں، خواہ وہ واقعہ کسی مرفوع حدیث میں آیا ہو یا موقوف ہیں، یا کسی تابعی نے اُسے بیان کیا ہو جو کسی طرح اس واقعے کا گواہ نہیں ہوسکتا۔ یا اس کا تعلق اسرائیلیات (بنی اسرائیل کے قصے کہانیاں) سے ہو۔ مفسرین کا یہ گروہ محدّثین کہلاتا ہے۔

2۔ متکلمین:

دوسرا گروہ متکلمین کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی تاویل و توجیہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ وہ اس بارے میں الفاظ کا ظاہری مفہوم نہیں لیتا، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ ان لوگوں نے تفسیر میں بھی اپنا یہی انداز اختیار کیا ہے۔ وہ جن آیتوں کے ظاہری مفہوم کو اپنے خیال میں اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف سمجھتا ہے ان کی تاویل کر دیتا ہے۔ ان کا حریف (Rival) مکتب فکر (School of Thought) جب اس حوالے سے الفاظ کا ظاہری مفہوم لیتا ہے تو یہ لوگ اس کی تردید کر دیتے ہیں۔

3۔فقہاء کا گروہ:

مفسرین کا تیسرا گروہ فقہاء اور اصولیین کا ہے جو قرآنی آیات سے فقہی احکام نکالتا ہے۔ بعض مسائل میں ترجیح دینے کا کام کرتا ہے اور اس کے لیے دلائل دیتا ہے۔ اگر کسی آیت سے کئی احکام نکلتے ہوں تو وہ اپنی رائے کے مطابق ان میں سے بہتر اور راجح کو اختیار کرتا ہے اور اپنے سے اختلاف کرنے والوں کے نقطۂ نظر کی تردید کرتا ہے۔

4۔لغت اور صرف ونحو کے ماہرین کا گروہ:

مفسرین کا چوتھا گروہ لغت اور گریمر کے ماہرین کا ہے، جو قرآنی الفاظ کے معانی، الفاظ کے مختلف استعمالات (Usages) اور ان کی صرفی ونحوی (Grammatical) حیثیت سے بحث کرتا ہے۔ یہ گروہ الفاظ کے معانی اور لغت ونحو کے حوالے سے عربوں کے کلام سے استشہاد کرتا اور ثبوت پیش کرتا ہے۔

5۔ادیبوں کا گروہ:

مفسرین کا یہ گروہ قرآنِ مجید میں علم معانی اور علم بیان کے نکتے تلاش کر کے ان کو بیان کرتا ہے اور قرآن کی فصاحت و بلاغت کے پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔ یہ ادیبوں کا گروہ کہلاتا ہے۔

6۔قراء کا گروہ:

یہ گروہ قرآنِ مجید کی مختلف قرائتوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ قرآن کی مشہور قراءتوں کو نقل کرنا اور ان کو بیان کرنا ان کا کام ہے اور وہ اس بارے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ یہ قراء یعنی قاریوں کا گروہ ہے۔

7۔صوفیا کا گروہ:

مفسرین کا یہ چھوٹا گروہ ان لوگوں کا ہے جو تصوف اور سلوک سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ

لوگ قرآن سے تصوف کے مسائل تلاش کر کے ان کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ ان کو قرآن میں جہاں کہیں کوئی صوفیانہ نکتہ ملتا ہے یہ اس کی تشریح کر دیتے ہیں۔

الغرض تفسیر کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا مفسرین نے اپنے اپنے ذوق اور قابلیت کے مطابق اس کی تفسیر کر دی ہے اور اپنے مسلک کو بھی پیش نظر رکھا ہے، جس کے سبب علم تفسیر میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اتنی تفسیری کتب لکھی گئی ہیں، جن کا کوئی شمار نہیں۔

اس کے علاوہ بعض علماء نے مذکورہ تمام قسم کی تفاسیر کو جمع کرتے ہوئے جامع تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ جو عربی زبان میں بھی ہیں اور فارسی زبان میں بھی۔ (اور اب اُردو زبان میں بھی۔ مترجم) کسی نے مختصر تفسیر لکھی تو کسی نے مفصل (Detailed)۔ اس طرح تفسیر کا میدان بہت وسیع ہو گیا۔

تفسیر کی تمام مذکورہ اقسام میری نظر میں ہیں۔ میں ان کے اصولوں اور تفصیلات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے ان تمام قسم کی تفسیروں پر مجتہدانہ طور پر تحقیق کی ہے۔ بلکہ ان کے علاوہ تفسیر کی دو ایک قسمیں ایسی ہیں جو مجھے براہِ راست الہام ہوئی ہیں اور جن کو اس کتاب میں لکھ رہا ہوں اور یہ ایک ایسی سعادت ہے جس کا شکر کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔

(مصنف مرحوم کا یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ مترجم)

اہل حدیث کی تفاسیر اور شانِ نزول:

علم تفسیر کا ایک اہم موضوع سورتوں اور آیتوں کا شانِ نزول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن حالات و واقعات کو سمجھا جائے جن کے بارے میں کوئی سورت یا آیت نازل ہوئی۔

شانِ نزول (یا اسبابِ نزول) کی دو قسمیں ہیں اُن میں ایک قسم وہ ہے جن میں ایسے واقعات اور حالات شامل ہیں جن کے بغیر سورتوں یا آیتوں کا صحیح مفہوم سمجھا نہیں جا سکتا۔

مثال کے طور پر نبی کریم ﷺ کے مبارک زمانے میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے

مومنوں کا ایمان اور منافقوں کی منافقت ظاہر ہوگئی۔ دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ پہچان لیے گئے جیسا کہ غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق (احزاب) کے موقع پر ہوا۔ ایسی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی تعریف کی ہے اور منافقین کی مذمت کی ہے۔ اس قسم کی آیتوں میں بعض اشارات ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص واقعے سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان اشارات کو سمجھنے کے لیے پورے واقعے کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک مفسر کا کام یہ ہے کہ وہ اس قسم کے کسی واقعے کو مختصر طور پر بیان کردے تاکہ پڑھنے والوں کو ان آیات کا پسِ منظر (Back Ground) معلوم ہوجائے اور اس طرح اُن آیتوں کا سمجھنا آسان ہوجائے۔

شانِ نزول کی دوسری قسم وہ ہے جس کے پسِ منظر میں اگرچہ بعض آیات کے نزول کے وقت کچھ خاص حالات و واقعات تھے مگر اُن کا ان آیتوں کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایسی آیتوں میں کوئی عام حکم ہوتا ہے، جو کسی خاص حالت یا واقعے سے متعلق نہیں ہوتا۔ ایسی آیتوں کو سمجھنے کے لیے اُن خاص حالات و واقعات کو جاننا بھی ضروری نہیں ہوتا جن میں وہ نازل ہوئیں۔ ایسی آیات کے شانِ نزول کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود قدیم مفسرین ان حالات و واقعات کو بیان کرنا ضروری سمجھتے تھے، غالباً اُن کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح وہ عام حکم والی آیات کے بارے میں ایسی معلومات جمع کردیں جن سے لوگوں کو ان آیتوں کے خاص پس منظر سے بھی واقفیت ہوجائے۔

صحابہ و تابعین اور شانِ نزول:

میرے نزدیک اصل حقیقت یہ ہے کہ آیات کے شانِ نزول کے بارے میں صحابہ و تابعین کا یہ اندازِ بیان کہ:

«نَزَلَتْ اٰيَةٌ فِيْ كَذَا»

''یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی۔''

ایسا تھا جس سے بعد میں غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ کیونکہ جب وہ یہ فقرہ کہتے تھے تو اس سے اُن

کی مراد یہ نہیں ہوتی تھی کہ واقعی فلاں آیات کا یہی شانِ نزول ہے بلکہ وہ ایسے تمام واقعات بیان کر دیتے تھے جن پر اس آیت کے مضمون کا اطلاق (Application) ہوتا تھا۔ گویا وہ ایسے تمام حالات بیان کر دینا چاہتے تھے جن میں کوئی آیت اُن کی رہنمائی کرتی تھی۔ اس بارے میں وہ کوئی پرواہ نہ کرتے تھے کہ یہ واقعہ آیت کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے یا بعد کا، اس کا تعلق اسرائیلیات (بنی اسرائیل کی روایات اور قصے کہانیاں) سے ہے، یا جاہلیت کے دور سے، اور کیا اس آیت کا مکمل مضمون اس واقعے سے مناسبت رکھتا ہے یا صرف معمولی مشابہت رکھتا ہے۔ ان کو ان میں سے کسی سے کوئی غرض نہ تھی بلکہ وہ اس واقعے سے کسی آیت کی معمولی مناسبت یا مشابہت ہونے پر بھی اس کو اس آیت کا شانِ نزول قرار دیتے تھے۔

دو پہلو:

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شانِ نزول کی تفسیری روایات میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہے۔ جب صحابہ اور تابعین نے اپنے اجتہاد سے ایک ہی آیت یا سورت کے کئی کئی شانِ نزول قرار دے دیے ہیں تو اس اختلاف کو معمولی غور و فکر کر کے دور بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن نے بعض گذشتہ واقعات اور قصوں کی طرف محض اشارات کیے ہیں لیکن مفسرین جب ایسی کسی آیت کی تفسیر لکھتے ہیں تو اُن کو اُن کے پورے قصے کی جستجو ہوتی ہے، پھر وہ اسرائیلیات یا تاریخی کتب کی مدد سے اس قصے کی تمام تفصیلات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ قرآن کا مقصد اس قصے کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہوتا، محض اس کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے، اور عام طور پر قصہ بیان کیے بغیر بھی اُس آیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

البتہ بعض مقامات پر قرآن اس طرح کے اشارات کرتا ہے جسے پورا قصہ واضح نہیں ہوتا۔ ایک عربی زبان جاننے والا شخص اس مقام پر ٹھہر جاتا ہے۔ اسے ان آیات کو سمجھنے کے لیے تفصیلی واقعے کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک مفسر کا یہ کام ہے کہ وہ پورے واقعے اور قصے کو بیان کر دے۔ لیکن جو واقعات اس قسم کے نہ ہوں اور اُن کا احکام

سے بھی تعلق نہ ہو اُن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں، مثال کے طور پر بنی اسرائیل کے قصے میں جس گائے کے ذبح کرنے کا ذکر آیا ہے، اس کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ وہ نر تھا یا مادہ تھی۔ اس طرح اصحابِ کہف کے کتے کے بارے میں یہ بحث کرنا کہ وہ سیاہ رنگ کا تھا یا سرخ رنگ کا، بالکل فضول ہے۔ صحابہ کرام ایسی بحثوں کو ناپسند کرتے تھے اور اسے وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔

دو نکات:

واقعات اور قصص کے بارے میں دو اہم نکتے پیش نظر رکھنے چاہئیں:

1۔ جہاں تک تاریخی واقعات کو بیان کرنے کا تعلق ہے اس میں عقل کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ واقعہ جیسے سنا ہے ویسے بیان کرنا چاہیے مگر قدیم مفسرین کا ایک گروہ قرآن کے اشارات کو سامنے رکھ کر ان کی روشنی میں قصے کی پوری تفصیل کا ایک نقشہ خود ہی مرتب کر لیتا تھا، پھر اسے واقعی حقیقت کے طور پر پیش کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے۔

2۔ سلف صالحین کے دور میں مختلف باتوں کے لیے الگ الگ اسلوبِ بیان نہ تھا، ان کے ہاں امکانی اور حقیقی باتیں آپس میں گڈ مڈ ہو جاتی تھیں۔ لیکن بعد میں کسی امکان کو حقیقت اور کسی حقیقت کو امکان سمجھ لیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تفسیر لکھنے کا میدان بھی ذاتی آراء اور قیاس و گمان سے خالی نہیں رہا۔ لہٰذا اب اس میں عقل کے استعمال اور نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

جو شخص بھی مذکورہ دو نکتوں کو ذہن نشین کر لے گا اُس کے لیے مفسرین کے اختلافات کی حقیقت کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ وہ صحابہ و تابعین کی طرف منسوب اقوال کو بھی اسی تناظر میں دیکھے گا اور سمجھ لے گا کہ وہ حرفِ آخر نہیں ہیں بلکہ ان میں مزید تحقیق اور اجتہاد سے اصل حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے۔

مثال کے طور پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا آیتِ وضو کے بارے میں یہ قول ملتا ہے:

''مجھے تو اللہ کی کتاب میں وضو کے لیے پاؤں پر صرف مسح کرنے کا حکم ملتا ہے لیکن لوگ ان کو دھونے سے کم پر راضی نہیں ہیں۔''

لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پاؤں پر مسح کے ہرگز قائل نہ تھے بلکہ وہ وضو میں پاؤں دھونے ہی کو ضروری سمجھتے تھے۔ دراصل اُنہوں نے صرف ایک شبہے کا اظہار کیا ہے جو آیت کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتا ہے کہ پاؤں پر مسح ہونا چاہیے۔ حقیقت میں وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ وقت کے علماء وضو کی آیت سے بظاہر پیدا ہونے والا شبہ دور کیسے کرتے ہیں؟ لیکن جو لوگ صحابہ و تابعین کے اس طرزِ گفتگو سے ناواقف تھے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کا یہ مطلب لے لیا کہ اُن کے نزدیک وضو میں پاؤں دھونے ضروری نہیں بلکہ ان پر مسح کرنا ضروری ہے، حالاں کہ یہ اصل حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

اسرائیلیات (بنی اسرائیل کے قصے کہانیاں):

قرآن مجید کی تفسیر کے حوالے سے واقعات وقصص کا دوسرا قابلِ توجہ پہلو وہ اسرائیلی روایات ہیں جن کو اسرائیلیات کہا جاتا ہے۔ یہ روایات ہماری تفسیری کتب میں موجود ہیں۔ حالاں کہ ان کے بارے میں حضورؐ کی حدیث یہ تھی کہ ہم نہ تو ان باتوں کو سچ مانیں اور نہ جھوٹا قرار دیں بلکہ خاموشی اختیار کریں۔

لہٰذا اس حوالے سے دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

1۔ ایک یہ کہ قرآن نے بنی اسرائیل کے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے اُن کی تفصیل جب تک صحیح احادیث میں نہ ملے اُن کو اہل کتاب کی روایات سے لے کر اپنی تفسیری کتب میں ہرگز نقل نہ کیا جائے۔ جو کچھ اور جتنا کچھ صحیح احادیث سے ثابت ہے صرف اُسے بیان کیا جائے۔ خواہ مخواہ تفصیل میں جانے سے گریز کیا جائے۔

مثال کے طور پر قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿34﴾ ﴾

[ص:23]

''اور ہم نے سلیمانؑ کو آزمایا اور اس کی کرسی پر دھڑ ڈال دیا۔ پھر اُنہوں نے رجوع کیا۔''

اس آیت کے بارے میں ایک حدیث ملتی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کوئی کام کرنے سے پہلے ان شاء اللہ کہنا بھول گئے، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوئی۔ مگر اس کے برعکس اسرائیلی روایات میں ایک پتھر اور سانپ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے لیکن ہم حدیث نبوی کے بعد ایسی اسرائیلی روایات کیوں نقل کریں۔

2۔ دوسری بات جو اسرائیلی روایات کے سلسلے میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ:

''ضروری اتنا ہی ہے جتنے کی ضرورت ہے۔''

لہٰذا جب کوئی ایسا واقعہ بیان کرنا ہو تو صرف اتنا ہی بیان کیا جائے جتنا قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ اس کی تصدیق قرآن سے ہو سکے، زیادہ تفصیل بیان کرنے سے خاموشی بہتر ہے۔

قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے:

اس مقام پر یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ وہ کبھی ایک ہی قصے کو ایک جگہ مختصر اور دوسری جگہ تفصیل سے بیان کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر آدم علیہ السلام کے قصے میں فرشتوں کے اعتراض کے جواب میں مختصر طور پر ارشاد ہوا کہ:

﴿ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿30﴾ ﴾ [البقرہ:30]

''فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔''

لیکن دوسری جگہ اس کی تفصیل میں یہ بھی فرمادیا گیا:

﴿ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (33) ﴾ [البقرہ:33]

''فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ چھپاتے ہو۔''

دوسری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ہے جسے سورۂ مریم میں مختصر طور پر یوں ذکر کیا گیا:

﴿ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا (21) ﴾

[مریم:21]

''اور تا کہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں، اُن کے لیے اپنی رحمت کا ذریعہ قرار دیں اور یہ اب طے شدہ بات ہے۔''

لیکن پھر اسی قصے کو سورۂ آل عمران میں پوری تفصیل سے بیان کر دیا گیا:

﴿ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ...... .... وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴾ [آل عمران:49 تا 54]

''اور ایک رسول بنی اسرائیل کی طرف، میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں .... اور اللہ بہترین چال چلنے والا ہے۔''

میرے رائے میں اس مقام پر اصل عبارت یوں تھی کہ:

((وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ (مُخْبِرًا) بِاَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ))

''اور بنی اسرائیل کی طرف (یہ خبر دینے والا) رسول بنا کر بھیجا کہ میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں......''

لیکن امام سیوطیؒ نے اس جگہ عبارت میں بعض الفاظ کو محذوف مانا ہے اور اُن کے نزدیک عبارت یوں ہے:

((حَیْثُ قَالَ فَلَمَّا بَعَثَهُ اللّٰهُ قَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ بِاَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ..........))

''اُنہوں نے اس وقت جب اللہ نے اُن کو مبعوث فرمایا، یہ کہا کہ بے شک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، بے شک میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں..........''

اسی طرح میرے نزدیک آیت کے مضمون میں بشارت اور خوشخبری کا مفہوم بھی شامل ہے، مگر امام سیوطیؒ نے آیت میں کوئی الفاظ کو محذوف قرار دیا ہے جو کہ میری رائے میں صحیح نہیں ہے۔

قرآن کے مشکل الفاظ کی تشریح:

قرآن مجید میں بعض مشکل الفاظ بھی آئے ہیں جن کو ''غریب القرآن'' کہا جاتا ہے، ان الفاظ کی تشریح کرنا بھی ایک مفسر کی ذمہ داری ہے۔

ان مشکل الفاظ کو سمجھنے کے دو طریقے ہیں:

1۔ ان الفاظ کے معانی عربی کے لغت (Dictionary) میں تلاش کیے جائیں۔

2۔ جس آیت میں کوئی مشکل لفظ آئے تو اس آیت کے سیاق وسباق (Context) کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے معنی متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن ان دونوں طریقوں میں مفسر کی اپنی رائے اور عقل وفہم کا بڑا دخل ہوتا ہے اور وہ اس بارے میں دوسروں سے اختلاف کرسکتا ہے۔

البتہ اس حوالے سے دو باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

1۔ پہلی یہ کہ عربی زبان میں کسی لفظ کے کئی معانی ہوسکتے ہیں۔

2۔ دوسری یہ کہ انسانوں کی عقل کا درجہ الگ الگ ہے۔

لہٰذا جب مختلف عقل والے لوگ کسی ایسے لفظ کے معنی متعین کریں گے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں تو لامحالہ اُن کے درمیان اختلاف ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مقامات پر صحابہ اور تابعین کے الگ الگ کبھی متضاد اقوال ملتے ہیں۔ لیکن ایسے موقع پر ہر ایک انصاف پسند اور غیر جانب دار مفسر کو چاہیے کہ وہ مشکل اور غریب الفاظ کی تشریح کرتے وقت دو باتوں کا خاص خیال رکھے:

1۔ ایک یہ کہ اہل عرب نے اس لفظ کو جتنے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے وہ ان سب کو پیش نظر رکھے۔ پھر غور و فکر کر کے یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ اس مقام پر ان میں سے کون سے معنی بہتر اور قابلِ ترجیح ہیں۔

2۔ دوسرے یہ کہ وہ آیات کے سیاق وسباق (Context) پر نظر رکھے اور دیکھے کہ اس جگہ یہ فقرے میں کون سے معنی زیادہ مناسب ہو سکتے ہیں اور پھر اُنہی کو اختیار کرے۔

میرا طریقہ:

اس سلسلے میں میرا یہ طریقہ ہے کہ میں پوری تحقیق کرتا ہوں جس سے مجھے ایسے ایسے نکات (Points) ملتے ہیں جن کے بارے میں کوئی تنگ نظر اور بے انصاف شخص ہی اختلاف کر سکتا ہے۔

اس حوالے سے میں نے جو تحقیق کی ہے اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

1۔ ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى..... ﴾ [البقرہ:178،179]

''تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے.........''

میرے نزدیک اس آیت میں قصاص کے حکم کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہر مقتول کا خون برابر ہے۔ لہٰذا قصاص صرف اس شخص سے لیا جائے گا جو قاتل ہے۔ اور جو قاتل نہیں ہے اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح ایک مقتول کے بدلے میں اس کے قاتل کے سوا کسی اور سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

آیت کا یہ مفہوم لینے کے بعد ﴿ اَلْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ﴾ (عورت کے بدلے عورت) میں جس مؤنث کا ذکر ہے اُس کے حکم کو بعض لوگوں نے منسوخ مانا ہے اور پھر اس کی فضول تاویلیں کی ہیں۔ میں نے جو تاویل اختیار کی ہے اس کے بعد نہ تو اسے منسوخ ماننا پڑتا ہے اور نہ اس کی بے کار تاویلیں کرنا پڑتی ہیں۔

2۔ ﴿ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط ﴾
[البقرہ:189]

''وہ آپؐ سے چاندوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپؐ کہہ دیں کہ وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اوقات ہیں۔''

میری تحقیق کے مطابق یہاں اَهِلَّة (نئے چاندوں) سے اَشْهُرٌ (مہینے) مراد ہیں یعنی حج کے مہینے، کیونکہ اس کے بعد جو جواب دیا گیا ہے وہ اسی کے کے مطابق ہے:

یہاں پر حج کا خاص طور پر ذکر ہونا ہمارے لیے ہوئے مفہوم کی تائید کرتا ہے۔ ورنہ تنہا کہہ دینا کافی تھا کہ: ﴿ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ ﴾ (وہ لوگوں کے لیے اوقات ہیں) اور اس کے ساتھ حج کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

3۔ ﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ط ..... ﴾
[الحشر:2]

''وہی اللہ ہے جس نے اہل کتاب کے کافروں کو پہلی ہی بار اکٹھا کر کے اُن کے گھروں سے نکال دیا............''

اس آیت میں میرے نزدیک لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (پہلی بار اکٹھا کرنے) سے لِاَوَّلِ جَمْعِ الْجُنُوْدِ (پہلی بار لشکروں کا جمع ہونا) مراد ہے۔ اگرچہ قرآنی الفاظ اور ان کے مفہوم میں کوئی ظاہری مناسبت نظر نہیں آتی لیکن غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں حَشْر کا لفظ لشکر کے معنوں میں بھی آیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿ وَابۡعَثۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ﴿۳۶﴾ ﴾ [الشعراء:36]

''اور تو شہروں میں لشکر بھیج دیں۔''

ایک اور مقام پر ہے:

﴿ وَحُشِرَ لِسُلَیۡمٰنَ جُنُوۡدُہٗ ﴾ [النمل:17]

''اور سلیمان (علیہ السلام) کے لیے اس کے لشکر جمع کیے گئے۔''

اس جگہ حَشۡر کا لفظ واضح طور پر لشکر کو جمع کرنے کے معنوں میں آیا ہے۔

اُوپر جس آیت میں اہل کتاب کے کافروں کا ذکر ہے اس سے یہودیوں کا قبیلہ بنی نضیر مراد ہے۔ اس لیے میرے نزدیک آیت کا وہی مفہوم بہتر اور قابل ترجیح ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔

ناسخ ومنسوخ:

قرآن فہمی کی مشکلات میں ایک اور مشکل ناسخ ومنسوخ کی بحث ہے۔ اگر اسے صحیح طریقے پر نہ سمجھا جائے تو آیتوں کا مطلب سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

اس سلسلے میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

1۔ ایک یہ کہ صحابہ وتابعین کے ہاں نسخ (کسی آیت کے حکم کا منسوخ ہونا) کا لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا تھا وہ اُن معنوں سے بالکل مختلف ہے جن معنوں میں بعد کے لوگوں نے اسے بطورِ اصطلاح (Term) استعمال کیا ہے۔

صحابہ وتابعین کے نزدیک نسخ کے معنی قریبا وہی ہیں جو اس لفظ کے لغوی معنی ہیں یعنی ''کسی چیز کو زائل کرنا'' یا ''اُسے ہٹا دینا'' چنانچہ اُن کے ہاں نسخ کا مفہوم یہ تھا:

''پہلی آیت کے حکم کو دوسری آیت کے حکم کے ذریعے ختم کرنا۔''

پھر اس کی کوئی صورتیں ہیں:

(۱) کبھی دوسری آیت کے حکم کے ذریعے یہ وضاحت کردی جاتی ہے کہ پہلی آیت میں جو

حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرنے کی مدت ختم ہوگئی ہے۔

(ب) کبھی دوسری آیت میں کچھ ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جن سے پہلی آیت کے ظاہری حکم کی بجائے ذہن کسی دوسرے حکم کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جس سے پہلا حکم خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

(ج) کبھی نسخ کی یہ صورت ہوتی ہے کہ دوسری آیت کے حکم میں کوئی ایسی شرط لگی ہوتی ہے جو پہلی آیت کے عام حکم کو خاص کر دیتی ہے۔ اس طرح پہلے حکم کو منسوخ سمجھ لیا جاتا ہے۔

(د) کبھی دوسری آیت کے حکم میں کوئی ایسا نکتہ پیش کیا جاتا ہے جس سے پہلی آیت کا حکم متعین ہو جاتا ہے اور اب تک اس کا جو حکم سمجھا جا تا رہا ہے وہ منسوخ ہو جاتا ہے۔

نسخ کی ان تمام صورتوں کی وجہ سے اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی، پھر اس میں رائے، عقل اور اجتہاد کا بہت عمل دخل ہو گیا، جس کے نتیجے میں بہت سے اختلافات سامنے آ گئے۔ اس طرح منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو (500) تک پہنچ گئی۔

2۔ دوسری بات جسے نسخ کی بحث میں پیش نظر رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ نسخ کا سارا دار و مدار تاریخ کے علم پر ہے اور صحابہ و تابعین کے نزدیک نسخ کا جو مفہوم ہے اس سے کسی آیت کے واقعی منسوخ ہونے کا پتہ چلانا بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ اس کا ایک حل یہ نکالا گیا کہ گذشتہ تاریخ کا سہارا لیا جائے۔ پھر کبھی سلف صالحین کے اجماع کو کسی آیت کے منسوخ ہونے کی دلیل سمجھ لیا گیا۔ کبھی علماء کا اتفاق کسی آیت کے منسوخ ہونے کی دلیل ٹھہری، اسی طرح مذکورہ دونوں گروہ جس آیت کے منسوخ ہونے پر متفق ہوں وہ بھی منسوخ قرار پائی۔ اس غلطی کا ارتکاب عام لوگوں نے نہیں کیا۔ بڑے بڑے فقہاء سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔ حالاں کہ اس معاملے میں اجماع اور اتفاق پر اعتماد کر لینا غلط تھا، کیونکہ اس کا امکان تھا کہ اجماعی طور پر جس آیت کا جو مطلب سمجھ لیا گیا وہ حقیقی مفہوم کے خلاف ہو۔ ایسی صورت میں کسی آیت کے منسوخ ہونے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

الغرض منسوخ آیات کی بحث میں اس طرح کی کئی مشکلات حائل ہیں۔

پھر محدثین کے گروہ نے اسی نسخ کے بارے میں الگ راہ اختیار کی۔ اُنھوں نے نہ صرف مذکورہ بالا نسخ کی تمام صورتوں کو قبول کیا بلکہ اس کے علاوہ اس میں کچھ اور صورتیں بھی داخل کر دیں۔ مثال کے طور پر کبھی صحابہ کرام کے درمیان کسی مسئلے پر کوئی مباحثہ ہوا، اس میں کسی صحابہ نے اپنے حق میں کوئی آیت کو بطورِ دلیل یا ثبوت کے لیے پیش کر دی یا اس آیت کو مثال (تمثیل) کے انداز میں بیان کر دیا۔ یا خود نبی کریم ﷺ نے کسی حکم کے حوالے سے کسی آیت کی تلاوت فرمادی۔ یا جو حدیث بھی کسی آیت کے مفہوم پر روشنی ڈالتی ہو، یا حضورؐ سے، یا صحابہ کرام سے کسی آیت کا کوئی خاص تلفظ، یا اُس کے کوئی خاص معنی ثابت ہوں......تو ان تمام صورتوں کو محدثین حضرات نسخ کے حوالے سے نقل کر دیا کرتے ہیں۔

باب 10

استنباط، توجیہ اور تاویل

قرآن فہمی کے لیے استنباط، توجیہ اور تاویل کی اصطلاحات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ان میں سے ہر ایک پر ہم الگ الگ بحث کریں گے۔

1۔ استنباط

استنباط کے معنی قرآنی آیات سے احکام نکالنے کے ہیں۔ یہ قرآن فہمی کا ایک اہم موضوع ہے جس کی بہت سی تفصیلات ہیں۔ اس میں آیت کا مفہوم، اس کے اشارات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں عقل اور رائے کا بھی بڑا دخل ہے۔ جس کے نتیجے میں اس حوالے سے بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔

قرآنی آیات سے احکام نکالنے کے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ میرے نزدیک ان طریقوں کی تعداد دس (10) ہے۔ میں نے ان طریقوں کو ایک خاص انداز میں ترتیب دے کر ایک مقالہ تیار کیا ہے جو قرآن سے اخذ کیے ہوئے (Infered) احکام کو جانچنے کے لیے بہترین کسوٹی (Criterion) ہیں۔

2۔ توجیہ

علم تفسیر میں توجیہ کا موضوع بھی بہت اہم ہے۔ توجیہ کی کئی قسمیں ہیں۔ ہر مفسر کو توجیہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسی سے اس کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے اور تفسیر کے میدان میں اس کا

مقام متعین ہوتا ہے۔لیکن ہر مفسر اپنے خاص انداز سے توجیہ کرتا ہے۔اس لیے مفسرین کے ہاں اس بارے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔اگرچہ صحابہ کرام کے زمانے میں توجیہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل نہ تھی لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے قرآنی آیات کی کثرت سے توجیہ کی ہے۔

توجیہ کیا ہے؟

توجیہ کے معنی ہیں ''کسی مشکل مسئلے کو حل کرنا۔'' مثال کے طور پر کسی مصنف کی تحریر میں جہاں کہیں کوئی ایسا مقام آ جائے جسے سمجھنا مشکل ہو تو اس عبارت کی تشریح کرنے والا شخص اس مقام کی ایسی تشریح کر دے جس سے اس کا سمجھنا آسان ہو جائے تو اصطلاح میں اسے توجیہ کہتے ہیں۔

توجیہ کی اقسام:

چونکہ کسی کتاب کو پڑھنے والے ایک جیسی قابلیت کے مالک نہیں ہوتے اس لیے توجیہ کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔عام لوگوں کے لیے توجیہ کا جو معیار ہے ذہین لوگوں کے لیے اس سے الگ معیار ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی تحریر پڑھتے ہوئے ایک ذہین شخص کے دماغ میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا وہ حل چاہتا ہے۔لیکن ایک عام ذہنی سطح کا انسان اُسی تحریر پر سے یونہی سرسری طور پر گزر جاتا ہے۔اس کے ذہن میں نہ کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح عام آدمی کے لیے جن باتوں کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے ذہین شخص اُنہیں آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

توجیہ کے طریقے:

جو شخص ہر قسم کے لوگوں کی ذہنی سطح سے واقف ہوتا ہے وہ اُن کی ذہنی سطح پر اُتر کر اس کے مطابق اُن سے گفتگو کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیاتِ مخاصمہ یعنی وہ آیتیں جن میں غیر مسلموں سے بحث و مباحثہ کیا گیا ہے، کی توجیہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن کے مذہب کا ذکر کیا جائے اور اُن کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔

اسی طرح قرآن میں احکام کی آیات کے حوالے سے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ ان احکام کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ہر حکم کو نہایت واضح اور جامع انداز میں پیش کیا جائے۔

اسی طرح جن آیات کا تعلق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے ہے اُن کی توجیہ کا یہ طریقہ ہونا چاہیے کہ ان نعمتوں کی تفصیلات بتائی جائیں۔

اسی طرح جن آیات میں واقعات اور قصوں کا ذکر آیا ہے اُن کی توجیہ کا طریقہ یہ ہے کہ اُن کو ترتیب سے بیان کیا جائے اور قصے کے ضمن میں تمام اشارات و کنایات کی وضاحت کی جائے۔

اسی طرح جن آیتوں میں موت اور آخرت کی زندگی کا ذکر ہے، اُن کی توجیہ یوں کی جائے کہ پیش آنے والی ہر حالت کا صحیح نقشہ کھینچ کر اُسے واضح کیا جائے۔

توجیہ کا ایک اور انداز:

مذکورہ بالا توجیہات (Interpretations) کے علاوہ اور بھی توجیہ کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں جیسے:

1۔ کسی آیت کا مطلب سمجھنے میں اُلجھاؤ ہو تو اسے مثالوں کے ذریعے واضح کیا جائے۔
2۔ اگر کسی مقام پر دو عبارتوں یا دو دلیلوں کے درمیان بظاہر تضاد (Contradiction) نظر آتا ہو تو ایسی آیتوں کی توجیہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس تضاد کو دور کیا جائے۔
3۔ جہاں کسی آیت کا مفہوم عقل کے خلاف نظر آتا ہو وہاں توجیہ کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ عقل اور نقل (شریعت کی بات) میں مطابقت پیدا ہو جائے۔
4۔ اگر کسی مقام پر کوئی شبہ یا اشکال پیدا ہو تو اس کی توجیہ اس طرح کر دی جائے کہ وہ شبہ یا

اشکال دور ہو جائے۔

5۔ اگر کسی آیت سے دو مختلف قسم کے احکام نکلتے ہوں تو ان کی توجیہ کے لیے ان دونوں میں موافقت (Agreement) پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

6۔ قرآن میں جن مقامات پر اللہ تعالیٰ نے کچھ وعدے فرمائے ہیں وہاں اُن کے سچے ہونے کو واضح کیا جائے۔

7۔ قرآن کے عملی احکام کی وضاحت رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں کی جائے۔

صحابہ کرام نے توجیہ کی مذکورہ بالا تمام صورتوں کو اختیار کیا تھا۔لیکن ان سب کو تفصیل کے ساتھ مثالیں دے کر بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہر مشکل مقام کی ٹھیک ٹھیک توجیہ کر کے اس کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے۔

3۔تاویل

تاویل کا تعلق متشابہات آیات سے ہے۔اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ فقرے میں الفاظ کے ایسے معنی بیان کیے جائیں جو ظاہری معنی کے خلاف ہوں۔

لیکن اس بارے میں ہمارے متکلمین نے بڑے مبالغے سے کام لیا ہے اور تمام متشابہ آیات کی تاویل کر ڈالی ہے۔مگر میں تاویل کو پسند نہیں کرتا۔کیونکہ اکثر آیات متشابہات کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات سے ہے۔میرا مسلک یہ نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت بیان کروں اور اس پر بحث کروں۔بلکہ اس حوالے سے میرا مسلک وہی ہے جو امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور دوسرے تمام سلف صالحین کا تھا۔وہ مسلک یہ ہے کہ متشابہ آیات میں اُن کے ظاہری الفاظ اور حکم پر عمل کرنا چاہیے اور ان کی تاویل سے باز رہنا چاہیے۔میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ متشابہ آیتوں سے نکلنے والے عقائد اور احکام پر جھگڑا کیا جائے خواہ مخواہ اپنے مسلک کا دفاع کیا جائے۔دوسروں کے مسلک کی تردید

کی جائے اور یوں قرآن کی واضح تعلیمات کو چھوڑ دیا جائے۔

میرے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی متشابہ آیت کے الفاظ سے جو مفہوم ظاہر ہو اُسی کو اختیار کیا جائے۔ اسی کو اپنا مسلک قرار دیا جائے۔ اس کی کوئی پروا نہ کی جائے کہ دوسرے لوگ کیا کہتے ہیں اور کون اس کا حامی اور کون مخالف ہے۔

قرآن کی زبان:

قرآن کی زبان اور لُغت کو سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قدیم اہل عرب کا کلام دیکھا جائے اور اس لفظ کے مختلف استعمالات (Usages) پر نظر ڈالی جائے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ صحابہ وتابعین نے اس لفظ کے کون سے معنی اختیار کیے۔ وہ جس معنی پر متفق ہوں اُسے لے لیا جائے۔

قرآن کے الفاظ کی صرف ونحو (Grammar) کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ نحوی مسائل میں امام سیبویہ کی پیروی کرتا ہے اور اس کے مسلک کے خلاف ہر بات کی تاویل کرتا ہے خواہ وہ تاویل کتنی ہی فضول اور بھونڈی کیوں نہ ہو۔

میرے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے بلکہ سیاق وسباق (Context) میں جو بات زیادہ بہتر معلوم ہو اُسے اختیار کرنا چاہیے۔ خواہ وہ امام سیبویہ کے مسلک کے مطابق ہو یا فرّاء کے مسلک کے مطابق۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کی ایک آیت یہ ہے:

﴿ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ ﴾ [النساء:162]

''اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے۔''

اس آیت کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:

((سَتُقِيمُهَا الْعَرَبُ بِأَلْسِنَتِهَا))

''اہل عرب اپنی زبانوں سے اسے قائم رکھیں گے۔''

اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ جو فقرہ اور ترکیب بظاہر عربوں کے روزمرے اور

محاورے کے خلاف معلوم ہو، وہ بھی عربوں ہی کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔ کیونکہ وہ اہل زبان ہیں اور اُن کی زبان ہی مستند ہے۔ وہ اپنے خطبات اور عام گفتگو میں بھی نحو اور گریمر کے خلاف بولتے تھے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔

قرآن مجید قدیم عربوں کی زبان ہی میں نازل ہوا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں قرآن میں واؤ (وَ) کی جگہ یاء (ی) آ جائے، یا تثنیہ کی جگہ واحد استعمال ہو، یا مذکر کی جگہ مؤنث آ جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اہل عرب کے ہاں اس طرح کا استعمال عام تھا۔

مذکورہ آیت میں بھی **اَلْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ** (نصب کی حالت) کو **اَلْمُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ** (رفع کی حالت) سمجھ کر ترجمہ کرنا چاہیے۔

جہاں تک علم معانی اور علم بیان کا معاملہ ہے تو یہ وہ علوم ہیں جو صحابہ و تابعین کے بعد وجود میں آئے۔ اس لیے قرآن کے اسلوبِ بیان (Style) میں ان کی خاص اہمیت نہیں۔ البتہ علم معانی اور علم بیان کے حوالے سے قرآن کی وہ خوبیاں جن کو عام لوگ بھی سمجھ سکتے ہوں میں اُن کو مانتا ہوں۔ مگر ان علوم کی وہ باریکیاں اور موشگافیاں جو صرف ان علوم کے ماہرین ہی سمجھ سکتے ہوں اُن کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ قرآن نے اُن کو ملحوظ رکھا ہے اور وہ ان کا پابند ہے، میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کی تفسیر میں اُن موشگافیوں کو بیان کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔

جہاں تک صوفیا کے تفسیری نکات کا معاملہ ہے تو ان کا تفسیر سے کوئی تعلق نہیں۔ ان صوفیانہ تفسیری نکتوں کی حقیقت صرف یہ ہے کہ قرآن سنتے ہوئے کسی صوفی یا سالک کے دل پر جو کیفیت طاری ہوئی اس نے اُسے بیان کر دیا ہے۔ یہ اُن کے ذاتی تاثرات اور روحانی کیفیات ہیں جو دوسروں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

اس کی مثال یوں ہے جیسے کوئی عاشق کسی وقت لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنے اور وہ اپنی محبوبہ کو یاد کرنے لگ جائے اور اپنے احوال میں کھو جائے۔ اس سے دوسروں کو کیا سروکار؟

ایک اہم نکتہ:

اس مقام پر ایک اہم نکتہ پیش نظر رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فن اعتبار (Interpretation) کو درست قرار دیا ہے بلکہ اس پر خود بھی عمل فرمایا ہے تا کہ یہ دوسروں کے لیے بھی نمونہ بن جائے اور الہامی تعلیمات کو سمجھنے میں مدد دے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝5 ﴾ [اللیل:5]

''پھر جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور تقویٰ اختیار کیا۔''

اس آیت کو تقدیر کے مسئلے میں دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے اعمال کریں گے ان کو جنت اور اس کی نعمتیں ملیں گے اور جو اس کے خلاف کام کرتے ہیں اُن کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

لیکن فن اعتبار (Interpretation) کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کو ایک خاص حالت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اس حالت میں مبتلا ہو کر رہتا ہے خواہ وہ اسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ اس طرح اس آیت کا تقدیر کے مسئلے سے ربط (Link) پیدا ہو گیا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا ۝7 ﴾ [الشمس:7]

''قسم ہے انسان کی ذات کی اور جس نے اسے ٹھیک بنایا۔''

اس آیت کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی سے آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن اس کی یہ تعبیر (Interpretation) بھی درست ہے کہ نیکی اور بدی کے عام تصور میں اور انسان کی پیدائش کے وقت اس پر جو نیکی اور بدی کا تصور الہام کیا جاتا ہے ان دونوں تصورات (Concepts) میں چونکہ ایک طرح کی مشابہت (Resemblance) پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس آیت کو تقدیر کے مسئلے میں بھی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

باب 11

قرآن کے چند مشکل مقامات

قرآن میں بعض ایسے مشکل مقامات ہیں جن کو ان کی اہمیت کے پیش نظر احادیث کی کتابوں میں الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ان مشکل مقامات کی کئی قسمیں ہیں:

1۔ وہ آیات جن کا تعلق علم تذکیر بآلاء اللہ (اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں اور نعمتوں کے علم) سے ہے۔ان میں مشکل مقامات وہ ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہے۔ جیسے آیت الکرسی ، سورۂ اخلاص ، سورۂ الحشر کا آخری حصہ اور سورۂ المومن کی ابتدائی آیتیں۔

2۔ جن آیات کا تعلق علم تذکیر بایام اللہ (وہ علم جس میں قرآن نے تاریخی واقعات اور قصے بیان کیے ہیں) سے ہے اُن میں مشکل مقامات وہ ہیں جہاں کوئی ایسا قصہ بیان ہوا ہے جس کا ذکر قرآن میں بہت کم ہو۔ یا کسی ایسے قصے کو جو پہلے سے معلوم ہو لیکن اسے قرآن نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہو۔ یا کوئی بہت اہم واقعہ مذکور ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب خضر کے بارے میں فرمایا کہ میری تمنا تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جناب خضر کے ساتھ کچھ دیر اور رہتے اور صبر کرتے تا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی قدرت اور حکمت کے کچھ نمونے اور واقعات بتا دیتا۔

3۔ وہ آیات جن کا تعلق موت اور آخرت کی زندگی سے ہے۔ان میں مشکل مقامات وہ

ہیں جہاں قیامت کے واقعات کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر ایک حدیث نبوی ہے کہ:

''جو شخص قیامت کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے وہ سورۃ الشمس پڑھے۔''
[اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ..... التکویر:1]

4۔ احکام کی آیات میں مشکل مقامات وہ ہیں جہاں حدود کا ذکر آیا ہے جیسے زنا کی حد میں سو (100) کوڑوں (Lashes) کی حد بیان ہوئی ہے۔ یا کسی خاص حالت یا صورت کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ جیسے طلاق یافتہ عورت کے لیے تین حیض یا تین طہر کی عدت اور وراثت میں وارثوں کے الگ الگ حصے۔

5۔ اسی طرح علم مخاصمہ یعنی غیر مسلموں سے بحث و مباحثہ کی آیات میں مشکل مقامات وہ ہیں جہاں دوسرے مذاہب کی طرف سے اعتراضات اور قرآن کی طرف سے اُن کے عمدہ جوابات کا ذکر ہے۔ یا کسی غیر مسلم گروہ کی حالت کو پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہو جیسے:

﴿ مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿17﴾ صُمٌّ ۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿18﴾ ﴾ [البقرہ: 17،18]

''اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے اُن کی روشنی بجھا دی اور اُنہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ اب اُنہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ کبھی سیدھی راہ پر نہیں آئیں گے۔''

اس آیت میں کافروں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

6۔ اسی طرح جہاں بہت پرستی اور شرک کی خرابیوں کی وضاحت ہے اور جہاں خالق اور

مخلوق کے درمیان فرق ظاہر کرنے کے لیے آقا اور غلام کی مثالیں دی گئی ہیں، یہ بھی قرآن کے مشکل مقامات ہیں۔

7۔ ایسی آیتیں جن میں ریا کاری کی وجہ سے تمام اعمال ضائع ہونے کا ذکر ہے وہ بھی قرآن کے مشکل مقامات میں سے ہیں۔

8۔ قرآن کے بعد مقامات کلام کی بلاغت یا اسلوب بیان کی لطافت کی وجہ سے بھی مشکل ہو گئے ہیں جیسے سورۂ الرحمٰن کی آیات۔ یہ پوری سورت عجیب وغریب انداز رکھتی ہے جس کے سبب ایک حدیث میں اسے عروس القرآن یعنی قرآن کی دلہن کہا گیا ہے۔

9۔ جہاں کہیں سعید (خوش قسمت) اور شقی (بد قسمت) لوگوں کی حالت کو مخصوص انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی قرآن کے مشکل مقامات ہیں۔

قرآن مجید کے بارے میں ایک حدیث ہے کہ:

((لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ وَّ لِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ))

(قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے)

چنانچہ قرآن کے پانچوں علوم جن کا ذکر اس کتاب کے شروع میں کیا گیا ہے، ان سب کا ظاہر تو وہ ہے جس کی طرف آیت کے الفاظ صاف صاف وضاحت کر دیتے ہیں اور جسے عام طور پر معنی یا مطلب کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر علم کا الگ الگ باطن بھی ہے۔

چنانچہ علم تذکیر بآلاء اللہ یعنی قران کا وہ علم جس میں اللہ کی بڑی بڑی نشانیوں اور نعمتوں کا ذکر ہے، اس کا باطن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں پر غور و فکر کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا ذہنی اور باطنی مشاہدہ ہے۔

اسی طرح علم تذکیر بایام اللہ یعنی قرآن کا وہ علم جس میں تاریخی واقعات اور قصص بیان ہوئے ہیں، ان کا باطن اُن قصص و واقعات کے وہ نکات ہیں جن میں کسی بات کی تعریف یا مذمت کی گئی ہے۔ یا جن میں کسی عمل پر ثواب یا عذاب کا ذکر ہے۔ یا جس قصے اور واقعے سے جو سبق، نصیحت اور عبرت حاصل ہوتی ہو وہ اس کا باطن ہے۔

اسی طرح جن آیات کا تعلق جنت اور دوزخ سے ہے، اُن کا باطن یہ ہے کہ انسان کے دل میں اُمید اور خوف پیدا ہو۔ ایسی کیفیت طاری ہو جیسے کوئی جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

اسی طرح احکام کی آیتوں کا باطن یہ ہے کہ ہر آیت کے سیاق وسباق اور ارشادات کے ذریعے سے اس کے وہ پوشیدہ احکام معلوم کیے جائیں جو الفاظ سے براہِ راست ظاہر نہیں ہوتے۔

اسی طرح علم مخاصمہ یعنی غیر مسلموں سے بحث ومباحثے والی آیتوں کا باطن یہ ہے کہ اصل برائیوں کو سمجھا جائے، اس جیسی جتنی اور برائیاں ہوسکتی ہیں ان سب کو جاننے کی کوشش کی جائے۔

مذکورہ آیتوں کے ظاہری معنوں میں مطلع سے مراد ہے عربی زبان اور قرآن کی تفسیر سے متعلق دوسرے علوم جاننا۔ آیتوں کے باطن میں مطلع سے مراد ہے ذہن کی لطافت، صحیح فہم، باطنی نور اور دل کا اطمینان۔

باب 12

انبیائے کرام کے قصوں کی تاویل

1۔ قصوں کی تاویل:

تفسیر سے تعلق رکھنے والے وہ وہبی (Gifted) اور الہامی (Revealed) علوم جن کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ان میں سے ایک وہ علم ہے جسے انبیائے کرام کے قصوں کی تاویل (Interpretation) کا علم کہتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر ایک الگ کتاب لکھی ہے جس کا نام ''تاویل الاحادیث'' ہے۔

اس مقام پر تاویل سے مراد یہ ہے کہ ہر نبی کے زمانے میں جو واقعہ پیش آیا اس کی کوئی نہ کوئی خاص بنیاد ہوگی جس کا تعلق اس نبی اور اس کی اُمت کی صلاحیت اور استعداد (Capability) سے ہوگا۔ اسکے علاوہ اس کا تعلق ان تدابیر (Plans) سے ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں پسند یا اختیار فرمایا۔ گویا ہر قصے کی بنیاد تین چیزوں پر ہے:

1۔ نبی کی صلاحیت

2۔ اُمت کی استعداد

3۔ زمانے کا تقاضا

لہٰذا کسی قصے کی تاویل سے مراد یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں کی روشنی میں اس قصے کا مقصد واضح کیا جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت کا محتاج ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ﴾ [یوسف:6]

"اور وہ تمہیں باتوں کی حقیقت تک پہنچنے کا علم سکھائے گا۔"

پنجگانہ علوم کا تجزیہ (Analysis):

تفسیر سے تعلق رکھنے والا دوسرا وہبی علم (Gifted Knowledge) اُن پنجگانہ علوم کا تجزیہ ہے جو قرآن مجید کا اصل مقصد ہیں اور جن کی وضاحت اس کتاب کے شروع میں کی جا چکی ہے۔ لہٰذا اس بحث کو وہاں دیکھنا چاہیے۔ ان علوم کی کچھ تفصیل میں نے فارسی زبان میں بھی کی ہے جو عربی زبان کے بہت قریب ہے۔ میں نے اس کتاب میں کلام کے مختلف انداز اور اسالیب (Styles) سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا نام "فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن" ہے۔ اگرچہ اس میں بعض اُمور کو اس لیے تشنہ اور تفصیل طلب رہنے دیا گیا ہے کہ ان کی تفصیلات پڑھ کر بھی بہت سے لوگ ان کو سمجھ نہیں سکیں گے۔

قرآن کے خواص کا علم:

اس سلسلے کا تیسرا وہبی علم قرآن کے خواص (Characteristics) کا علم ہے۔ ماضی میں ایک گروہ نے اس علم پر بحث کی ہے مگر اُنہوں نے یا تو قرآن کو دعاؤں کی کتاب بنا دیا ہے یا اُسے جادو کی کتاب بنا ڈالا ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ.

لیکن اس عاجز پر اللہ تعالیٰ نے ایک نیا دروازہ کھولا ہے اور ایک ہی بار اسمائے حسنیٰ، آیاتِ عظیمہ اور تمام دعائیں میرے دامن میں رکھ دیں اور فرما دیا کہ:

"یہ ہمارا تحفہ ہے جسے تو اپنے تصرف اور استعمال میں لا سکتا ہے۔"

البتہ قرآن کی ہر آیت، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہر نام اور ہر قرآنی دعا کے ساتھ کچھ شرطیں اور پابندیاں ہیں جن کے لیے کوئی اُصول اور ضابطہ مقرر نہیں۔ صرف ایک یہی اصول ہے کہ انتظار کیا جائے اور دیکھا جائے کہ غیب کے پردے سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ استخارے میں ہوتا ہے۔ پھر یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ غیب سے کس آیت یا کس اسم کا اشارہ ملتا ہے۔ بہر حال آیتوں اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کا وظیفہ کسی بزرگ کے مشورے کے مطابق کرنا چاہیے۔

باب 13

حروفِ مقطعات کا حل

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علوم مجھ پر الہام ہوئے ہیں ان میں سے ایک حروفِ مقطعات کا علم بھی ہے۔

تمہید:

عربی زبان کے تمام حروف تہجی میں سے ہر حرف وسیع معنی رکھتا ہے۔ ان معنوں میں اتنی لطافت اور تازگی ہے کہ انہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ان سب کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

حرفوں کا اجتماع:

عربی زبان کے حروفِ تہجی کی ایک خصوصیت (Characteristic) یہ ہے کہ ایسے تمام حروف جن کے مادے (Roots) ایک دوسرے کے قریب یا مشابہ ہوں، تو اُن کے معنی بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔

زبان وادب کے ماہرین نے اس نکتے پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کسی لفظ میں نون (ن) اور فا (ف) اکٹھے ہوں تو اس میں خروج یعنی کسی چیز کے باہر نکلنے کے معنی پائے جاتے ہیں، جیسے:

نفر . نفث . نفح . نفخ . نفق . نفد . نفذ . وغیرہ

یہ تمام الفاظ کسی چیز کے اندر سے باہر آنے کے معنی دیتے ہیں، خواہ کسی چیز کا کسی ہجوم

سے نکلنا ہو یا کسی چیز کا سینے سے نکلنا ہو، یا کسی چیز کا ہاتھ سے نکلنا ہو۔ بہرحال نکلنے کا بنیادی مفہوم ہر لفظ میں پایا جاتا ہے۔

اسی طرح جب (ف) اور (ک) کسی لفظ میں جمع ہوں تو اس میں پھوٹنے اور شگاف ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں جیسے:

فلق . فلح. فلج . فلذ . فلذ . وغیرہ

ان تمام الفاظ میں سے ہر لفظ کسی نہ کسی چیز کے پھٹنے یا پھوٹنے کے معنی دیتا ہے، خواہ وہ پو کا پھٹنا ہو، یا اندھیرے کا چاک ہونا ہو، یا بیج کا زمین سے پھوٹنا ہو۔

حروف کی تبدیلی:

عربی زبان کے حروفِ تہجی کے بارے میں زبان و ادب کے بعض ماہرین (Linguistics) کا خیال ہے کہ اگر کسی لفظ کے تمام حروف کو باری باری ان حروف سے بدلا جائے جن کا مادہ (Root) یا مخرج (Place of Sound) کے قریب ہو تو ایک ہی لفظ بے شمار معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔

عربوں کے ہاں اس طرح کا استعمال (Usage) عام ہے۔ وہ کسی لفظ کے ایک ایک حرف کو باری باری تبدیل کر کے اسے کئی مختلف معنوں مین استعمال کر لیتے تھے۔ مثلاً:

دَقٌ کے (ق) کو (ث) سے بدل کر دَثٌ بنا لینا۔

لج کے (ج) کو (ز) سے بدل کر لَزٌ بنا لینا۔

عربوں کے کلام میں اسی طرح کی تبدیلی کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

اگرچہ حروفِ تہجی کی ان خصوصیات کا تعلق عربی زبان اور لغت سے ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قدیم عرب ان سے ناواقف تھے۔ عام عربوں کی بات نہیں علم نحو اور گریمر کے ماہرین بھی اس چیز سے آگاہ نہ تھے۔

مثال کے طور پر اگر ان سے اسم جنس کی تعریف کے بارے میں پوچھا جاتا، یا مختلف

مرکبات (Compound Words) کی خصوصیات پوچھی جاتیں تو وہ ان کی حقیقت نہ بتا سکتے لیکن وہ ان چیزوں کا استعمال جانتے تھے۔

اس کے علاوہ عربی زبان ولغت کے ماہرین کی قابلیت ایک جیسی نہ تھی ۔ ان میں بعض زیادہ ذہین اور نکتہ شناس تھے، وہ الفاظ کے ایسے معانی ومفاہیم سے باخبر تھے جن کو دوسرے لوگ نہیں جانتے تھے۔ وہ صرف ونحو (Grammar) کی ایسی باریکیوں سے واقف تھے جس سے دوسرے ناواقف تھے۔

حروفِ مقطعات:

حروفِ مقطعات دراصل اُن سورتوں کے نام یا اُن کے عنوانات (Titles) ہیں جن کے شروع میں وہ آئے ہیں۔ اگرچہ یہ نام اور عنوانات بہت مختصر ہیں لیکن یہ پوری سورت کے مضامین کی تفصیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے کسی کتاب کا ایسا نام یا عنوان (Titles) رکھا جاتا ہے جس سے اس میں درج تمام مضامین کی طرف ایک مجمل اشارہ ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا کتاب کے مطالعے کے دوران میں اُسے پیش نظر رکھتا ہے۔

جیسے امام بخاریؒ نے احادیث پر مبنی اپنی کتاب کا یہ نام رکھا ہے:

"الجامع الصحیح المسند فی حدیث رسول الله ﷺ"(1)

(مترجم کے نزدیک شاہ صاحبؒ کا یہ سہو ہے جو اُن کی کتاب کے عربی اور فارسی دونوں نسخوں میں موجود ہے۔ صحیح بخاری کا اصل نام یہ ہے: "اَلْجَامِعُ الْمُسْنَدُ الصَّحِیْحُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ اُمُوْرِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَسُنَّتِهٖ و اَیَّامِهٖ")

حروفِ مقطعات کی وضاحت:

اب چند حروف مقطعات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

1۔ الٓمّٓ:

یہ سورت کا نام یا عنوان ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں:

"عالم غیب کی وہ پوشیدہ حقیقتیں (Realities) جو اپنے مقام پر متعین اور معلوم ہونے کے باوجود عالم ظاہر یعنی دنیا میں غیر متعین اور نامعلوم تھیں، اب وہ اس دنیا میں بھی متعین اور معلوم ہوگئی ہیں۔"

ہم نے الٓمٓ کے جو معنی بیان کیے ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ ہمزہ (ء) اور ھا (ھ) کے دونوں حروف غیب کے معنی دیتے ہیں۔ البتہ ان دونوں میں فرق بھی ہے کہ (ہ) کا تعلق ہماری دنیا کے غیب سے ہے اور ہمزہ (ء) کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سوالیہ فقرے (Interrogative Sentence) میں جب کسی غیر متعین اور نامعلوم بات کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ اَمْ سے شروع کیا جاتا ہے۔ گویا اَمْ (حروفِ استفہام) میں بھی ہمزہ (ء) کو لایا گیا ہے اور جب اس طرح کے کسی سوالیہ فقرے پر کسی اور فقرے کا عطف (دو فقروں کو واؤ وغیرہ کے ساتھ ملانا) لایا جاتا ہے تو حرفِ اَوْ (یا۔ کیا) استعمال کیا جاتا ہے جس کا پہلا حرف بھی ہمزہ (ء) ہے۔ یہ عطف بھی ظاہر کرتا ہے کہ جس چھپی بات کے بارے میں سوال کیا جارہا ہے وہ ابھی تک بکھری ہوئی غیر متعین اور نامعلوم ہے۔ ورنہ اَوْ کے ذریعے سوال نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ سوال (استفہام) اور عطف دونوں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جن چیزوں کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ ابھی تک غیر متعین اور نامعلوم ہیں اور ہماری معلومات کے لحاظ سے غیب کی وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں ہمیں یقینی علم حاصل نہیں۔

اس طرح کے فقروں کے شروع میں ءَ (سوالیہ۔ استفہامیہ) بھی استعمال ہوتا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ جس چھپی بات کے بارے میں سوال کیا جارہا ہے اس کی ایک مبہم اور دھندلی سی شکل سوال کرنے والے کے ذہن میں بھی موجود ہے اور وہ فلاں چیز سے تعلق رکھتی ہے۔

2_ہ :

یہ سوال (استفہام) کے علاوہ ضمیر بھی ہے۔ دونوں کا تعلق غیب سے ہے جو آنکھوں سے

او جھل ہے۔ چنانچہ ہر سوال (استفہام) ہمیشہ نامعلوم چیزوں کے بارے میں ہوتا ہے اور ضمیر بھی کسی ایسی چیز یا اسم کی قائم مقام ہوتی ہے جو پوشیدہ ہو اور فقرے میں موجود نہ ہو۔ اس لیے ضمیر کا تعلق بھی غیب سے ہے اور ضمیر کے لیے بھی ھا (ہ) استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ھا (ہ) کا تعلق بھی غیب سے ہے۔ گویا یہ ھا (ہ) بھی غیب کو ظاہر کرتا ہے۔ البتہ سوال (یا استفہام) کا تعلق ایسے غیب سے ہوتا ہے جو ابھی تک غیر متعین اور نامعلوم ہو، لیکن ضمیر کا تعلق ایسے غیب سے ہوتا ہے جو پہلے متعین اور معلوم ہو چکا ہو۔

3-ل :

غیب کو ظاہر کرنے والے ہمزہ (ء) اور ھا (ہ) کے برعکس لام (ل) کسی ایسی چیز کو متعین کرنے کے معنوں میں آتا ہے جس کے وہ ساتھ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی غیر متعین کو متعین کرنا ہو جیسے اسم نکرہ (Common Noun) کو اسم معرفہ (Proper Noun) بنالیا جاتا ہے تو اس کے لیے اسم کے ساتھ لام (ل) لگا دیتے ہیں۔

4-م :

جب میم (م) کے حرف کے ساتھ ہمزہ (ء) اور لام (ل) اکٹھے ہو جائیں تو وہ ایک ایسی مجسم شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں مختلف قسم کے حقائق جمع ہوتے ہیں اور اس اجتماع کے بعد وہ چیز غیب کی دنیا سے نکل کر ہماری مادی زندگی میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

الغرض ان تینوں حروف کی مذکورہ بالا خصوصیات کے پیش نظر الٓمّ کے معنی یہ ہوئے کہ:

"وہ روحانی فیض جو عالمِ غیب کے ساتھ مخصوص تھا، اب ہماری دنیا میں آ گیا ہے اور انسانوں کے مزاج اور اُن کی فطرت کے مطابق متعین ہو چکا ہے، وہ انسانوں کے دلوں کی سختی کو اللہ تعالیٰ کی یاد کے ذریعے دُور کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ لوگوں کو بُری باتوں اور بُرے اعمال کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے گناہوں اور اُن کی نافرمانیوں پر اُن کو عذاب کا ڈر سُناتا ہے۔"

ہم نے الٓمّٓ کے جو معنی بیان کیے ہیں پوری سورۃ البقرہ اُن کی تشریح اور تفصیل ہے۔

5۔ الٓرٰ:

الٓمّٓ اور الٓرٰ میں صرف ایک حرف یعنی راء (ر) اور میم (م) کا فرق ہے۔ باقی دونوں حروف مشترک (Common) ہیں۔ لہٰذا الٓرٰ کے بھی وہی معنوی ہیں جو الٓمّٓ کے ہیں اور جن کی وضاحت اوپر کردی گئی ہے۔

البتہ ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ الٓرٰ میں تردّد (Hesitation) اور تکرار (Repitition) کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ چیز جو ایک بار اس مادی دنیا میں ظاہر ہو چکی ہے وہ اب دوبارہ ظاہر ہو رہی ہے۔

قرآن مجید میں الٓرٰ سے مراد وہ علوم بھی ہیں جو انسانوں کے برے اعمال کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس سے وہ تدبیریں (Measures) بھی مراد ہیں جو انسانی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اختیار کی ہیں۔ ان علوم اور تدابیر سے مراد انبیائے کرام کے قصے اور حالات و واقعات ہیں جن میں انہوں نے اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لیے کام کیا اور اُن سے سوال و جواب ہوئے۔

6۔ طٰ۔ صٓ:

طاء (ط) اور صاد (ص) کے معنی ایک ہی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ بلندی کی طرف حرکت کرنا۔

گویا مادی دنیا سے روحانی دنیا کی طرف پرواز کرنا۔ فرق صرف یہ ہے کہ طاء (ط) کے مفہوم میں ایسی بلندی شامل ہے جس میں مادی شان و شوکت پائی جاتی ہو۔ اس کے برعکس صاد (ص) کے مفہوم میں وہ بلندی شامل ہوتی ہے جس کا تعلق پاکیزگی اور لطافت سے ہو۔

7۔ سٓ:

سین (س) کا حرف کسی شے کے پھیل جانے کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن میں اس حرف کے

یہ معنی ہیں کہ عالمِ غیب کا فیض مادی دنیا میں ظاہر ہو کر ساری دنیا میں پھیل گیا ہے۔

8۔طٰهٰ:

طاھا (طٰهٰ) سے مراد انبیائے کرام کا وہ اعلیٰ مقام ہے جس کے بعد وہ روحانی عالم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس سے خاص تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ جس کے بعد ایک ایسی غیبی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جس میں تمام حقیقتوں کا علم مختصر طور پر موجود ہوتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں طٰهٰ سے مراد انبیائے کرام کا وہ مرتبہ ہے جس کے سبب وہ عالم غیب سے تعلق قائم کرتے ہیں اور بہت سی غیبی باتوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ جبکہ یہ سارے علوم اُن کتابوں میں درج تھے جو اس سے پہلے لکھی گئیں۔

9۔طٰسٓمٓ :

اس سے بھی انبیائے کرام کے درجات مراد ہیں۔ اس میں تین حروف ہیں ایک طاء (ط) جس کے معنی بلندی اور عظمت کے ہیں۔ دوسرا سین (س) جس کے معنی دنیا میں پھیلنے کے ہیں۔ تیسرا میم (م) جس کے معنی متعین کرنے کے ہیں۔

انبیائے کرام کو جو اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے اور اُن کو عالمِ بالا کے جو حقائق معلوم ہوتے ہیں اُن سے اُن علوم کا مادی دنیا میں ظاہر ہونا مراد ہے جو بعد میں ساری کائنات میں پھیل جاتے ہیں۔

گویا طٰسٓمٓ کا مطلب یہ ہے کہ:

"انبیائے کرام کو جو علوم عطا ہوئے وہ عالمِ ظاہر میں جاری ہوئے اور پھر ساری دنیا میں پھیل گئے۔"

10۔حاء (ح):

حاء (ح) کے معنی ھاء (ھ) کی طرح غیب کے ہیں۔ ان دنوں میں صرف یہ فرق ہے کہ ھاء (ھ) جس غیب کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ محض غیب ہے لیکن حاء (ح) جس غیب کی

طرف اشارہ کرتا ہے، اس میں روشنی اور ظاہر ہونے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

گویا حٰمٓ کے لفظ سے غیب کی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس میں روشنی اور ظہور کی کیفیت ہو۔ اس نے ہماری دنیا کی خصوصیات اس لیے اختیار کی ہیں تا کہ لوگوں کے غلط عقائد اور برے اعمال کی اصلاح ہو۔ اس سے قرآن کے وہ حقائق مراد ہیں جو اس نے گمراہ لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں پیش کیے ہیں اور ایسے لوگوں کی عادتوں، خصلتوں اور شکوک و شبہات پر تنقید کر کے اصل حقیقت واضح کی ہے۔

11۔عین (ع):

عین (ع) کا حرف ایک روشنی کے ظہور اس کے متعین ہو جانے کو ظاہر کرتا ہے۔

12۔قاف (ق):

قاف (ق) کا حرف بھی میم (م) کے حرف سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں بھی کسی چیز کے مخصوص اور متعین ہو جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ قاف (ق) کے مفہوم میں جو کیفیت ہے اس میں کسی چیز کے متعین اور متشخص ہونے (Personification) کے علاوہ قوت اور شدت بھی پائی جاتی ہے۔ جبکہ میم (م) کے حرف میں شکلوں اور صورتوں کے جمع ہو جانے کا مفہوم ہوتا ہے۔

لہٰذا عٓسٓقٓ سے وہ روشن حق مراد ہے جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔

13۔نون (ن):

نون (ن) کے حرف سے وہ روشنی مراد ہے جو تاریکی کے اندر سے پھوٹ کر پھیل جائے۔ گویا نون (ن) کے حرف سے وہ حالت مراد ہے جب روشنی اور تاریکی ملی ہوئی ہو۔ جیسے صبح صادق کا وقت۔ اسی سے ملتی جلتی وہ حالت بھی ہے جو شام کے ملگجے میں ہوتی ہے۔

14۔یاء (ی):

یاء (ی) کے وہی معنی ہیں جو نون (ن) کے ہیں۔ ان میں صرف اتنا فرق ہے کہ یاء

(ی) میں روشنی کی وہ تیزی اور شدت نہیں ہے جو نون (ن) کے مفہوم میں پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ یاء (ی) کو ھا (ھ) سے بھی مناسبت ہے۔لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ ھاء (ھ) کے مفہوم میں تعین اور تشخص (Appearance) زیادہ ہے اور یاء (ی) میں کم ہے۔ گویا یاء (ی) کا حرف ھاء (ھ) سے کم روشنی اور کم تشخص کو ظاہر کرتا ہے۔

15۔یٰسٓ:

یٰسٓ سے وہ حقائق اور معانی مراد ہیں جو سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔

16۔صٓ:

اس حرف سے مراد وہ حالت یا کیفیت ہے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، خواہ یہ توجہ فطری صلاحیت اور استعداد (Capability) کی بنا پر ہو یا محنت اور اکتساب (Self Earning) کے نتیجے میں ہو۔

17۔قاف (ق):

اس حرف کا مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس میں قوت، شدت اور جبر کے معنی پائے جاتے ہیں۔لہٰذا اس سے وہ قوت اور شدت مراد ہے جو مادی دنیا میں متعین اور متشخص ہو چکی ہے۔جیسے کوئی یہ کہے کہ میں ایسی حالت کی بات کرتا ہوں جو مختلف چیزوں کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنی اس بات سے جو کیفیت مراد لیتا ہے وہی قاف (ق) کے حرف کا حقیقی مفہوم ہے۔

18۔کاف (ک):

(ک) اور (ق) آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ان میں صرف یہ فرق ہے کہ (ک) میں کم اور (ق) میں زیادہ قوت اور طاقت پائی جاتی ہے۔

لہٰذا کٓھٰیٰعٓصٓ سے ایک ایسا مادی اور تاریک جہان مراد ہے جس میں بہت سے علوم و

معارف جمع ہو کر متعین ہو گئے ہوں۔ ان علوم و معارف میں سے کچھ روشن اور چمک دار ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو روشن اور چمک دار نہیں ہیں لیکن ان سب کا رجوع اور جھکاؤ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

مختصر یہ کہ حروف مقطعات کے مذکورہ معانی میرے دل پر القاء (Reveal) ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق ذوق اور وجدان (Intution) سے ہے۔ ان معانی کو الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ہم نے ان حروف کے معانی کو جن الفاظ سے بیان کر دیا ہے وہ الفاظ بھی اصل حقیقت کو پوری طرح ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ کئی لحاظ سے اپنے حقیقی مفہوم ہی کے اُلٹ ہوں۔ (۱)

(۱) حروفِ مقطعات کی اس پوری تشریح سے مترجم کو شدید اختلاف ہے۔ کاش! شاہ صاحبؒ یہ فضول بحث لکھنے کی زحمت نہ فرماتے۔